رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۲۷	ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء	عدد ۵، ۶

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چیمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک مدت سے ان صفحات میں مرکز کے حالات اور کاموں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو یہاں کے حالات کے لیے برابر انتظار بھی رہتا ہے اور ہم ان کو یہاں کے کاموں کی رفتار اور دوسری ضروری باتوں سے باخبر رکھنا ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ اس کوتاہی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواہش تھی کہ سالانہ اجتماع کے موقع پر، اس سال کے لیے جو باتیں طے ہوئی تھیں، ان کے بروئے کار آنے کی کوئی شکل پیدا ہو تو ارکان اور ہمدردوں کو ان سے مطلع کریں، صرف موانع اور عذرات کا ذکر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سالانہ اجتماع پر کئی مہینے گذر گئے اور اب تک ہم ان مشکلات پر قابو نہ پا سکے جو ہمارے سامنے تھیں اور نہ بظاہر حالات اس بات کی توقع ہے کہ ہم جلد ان پر قابو پا سکیں گے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ لوگوں کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ انھیں اس بات کا علم رہے کہ تجاویز کے عمل میں آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے نہ وہ بلا سبب ہے اور نہ ہماری غفلت کی وجہ سے ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ایک عرصہ سے امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طبیعت برابر خراب چلی جا رہی ہے۔ سالانہ اجتماع سے پہلے ان پر بیماری کے متعدد حملے ہو چکے تھے اور وہ اس قابل نہ تھے کہ اجتماع کی کارروائیوں کی نگرانی کر سکتے لیکن اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اس وجہ سے انھیں مجبوراً اس سلسلہ کے سارے فرائض انجام دینے پڑے، جس کا اثر ان کی صحت پر نہایت خراب پڑا۔ اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے چاہا کہ ان کو کچھ آرام کرنے کا موقع ملے لیکن حالات ایسے تھے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اب تک صورت حالات یہ رہی ہے کہ جماعت کے سارے شعبے تنہا ان کی ذات سے وابستہ رہے ہیں۔ وہی جماعت کے امیر تھے، وہی ترجمان القرآن کے اڈیٹر تھے، وہی تنظیم جماعت کے سلسلہ کے امور کی نگرانی کرتے تھے، وہی استفسارات کے جواب لکھتے تھے۔ اور وہی سارا حساب کتاب رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اور درس کا سلسلہ مزید براں۔ اس وجہ سے اس بات کا موقع بالکل نہیں تھا کہ وہ مرکز سے کچھ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو کر اپنی صحت کی فکر کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرمیوں میں ان کی صحت اس قدر گر گئی کہ وہ کام کرنے کے بالکل قابل نہیں رہے اور مجبور ہوئے کہ یہاں کی ذمہ داریوں کو دوسروں پر چھوڑ کر اپنے علاج کی فکر کریں۔ اس غرض کے لیے وہ دلی گئے۔ دلی میں گرمیوں کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے لیکن یونانی علاج جو نسبۃً ان کے مزاج کے موافق ہے، وہیں اچھا ہو سکتا تھا، اس وجہ سے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ اس قیام سے انھیں تھوڑا بہت

فائدہ تو ضرور ہوا لیکن کچھ تو وہاں کے موسم کی خرابی اور کچھ مرکز کی ضروریات نے مجبور کیا اور وہ برسات کے شروع میں واپس آگئے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان پر زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ نہ پڑنے پائے لیکن یہاں رہ کر پوری یکسوئی ممکن نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر بیمار پڑے۔ اس بیماری سے اٹھنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ آرام کرنے کی مہلت پاتے یکم اکتوبر سے باقاعدہ پھر کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ابھی ایک مہینہ بھی پوری پابندی سے کام نہیں کرنے پائے تھے کہ پھر صحت گرتی ہوئی نظر آئی۔ امرت سر جاکر اکسرے سے معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ بائیں گردے میں پتھری ہے اور یہ سارے فسادات اسی کے کرشمے ہیں۔ اب یونانی طریقہ پر اس کا علاج ہو رہا ہے اور خدائے علیم و خبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ پردۂ غیب میں کیا ہے اور آئندہ اس کے علاج کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مرض دور ہو اور خدمت دین کا جو کام سامنے ہے اس کے کرنے کے لیے ہمت اور قوت عطا ہو۔

ان صفحات میں شخصی حالات کا کبھی ذکر نہیں آتا لیکن مولانا کی اس بیماری کا ذکر مجبوراً اس وجہ سے کرنا پڑا کہ بہت سے لوگوں کو ترجمان القرآن کی تاخیر اشاعت سے شکایت ہے۔ بعض لوگوں کو تفہیم القرآن کا سلسلہ برابر جاری نہ رہنے پر رنج ہے۔ بعض لوگ استفسارات کے جواب جلد نہ پانے سے آزردہ ہو رہے ہیں، بہت سے لوگ تعلیمی اسکیم کے اب تک جاری نہ ہونے سے مایوس ہو رہے ہیں۔ ان سب حضرات کو معلوم ہو جائے کہ ادھر ایک عرصہ سے کاموں کے تسلسل اور ان کی باضابطگی میں جو خلل پیدا ہوتا رہا ہے اس میں جہاں وقت کے دوسرے حالات کو دخل رہا ہے وہاں امیر جماعت اور مدیر ترجمان القرآن کی علالت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس پر بندوں کو کوئی اختیار نہیں۔ البتہ اس اثنا میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہاں کے مختلف شعبوں کی ذمہ داریاں، جو تنہا امیر جماعت پر تھیں، تقسیم کر دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہت حد تک اس میں کامیابی ہوئی ہے اور جو کسر اب باقی رہ گئی ہے امید ہے کہ وہ بھی بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ اب یہاں کے وہ تمام شعبے، جن سے جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو واسطہ پڑتا ہے، مختلف ذمہ دار اور قابل اطمینان ہاتھوں میں ہیں توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ ترجمان القرآن کو بھی وقت پر لانے کی پوری کوشش جاری ہے۔ اب اس کے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ انشاء اللہ یہ پابندی کے ساتھ ماہ بماہ خریداروں تک پہنچ جایا کرے گا۔ البتہ جب تک مدیر ترجمان القرآن بیمار ہیں اس وقت تک لوگوں کو خود ان کے مضامین کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ فی الحال اگر وہ تفہیم القرآن کا سلسلہ جاری رکھ سکیں تو یہی غنیمت ہے۔

تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں، سالانہ اجتماع کے موقع پر، یہ بات طے ہوئی تھی کہ فی الحال ثانوی تعلیم کے عارضی نظام کا آغاز کیا جائے۔ یہ فیصلہ تعمیر کی موجودہ مشکلات اور اسٹاف کی زحمتوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ بروقت ایک مختصر اسٹاف اور طلبہ کی ایک محدود تعداد کے قیام و تعلیم کے لیے چند جھونپڑے اور مکانات بنا لینے میں کچھ زیادہ زحمت نہ ہوگی اور اس مختصر نظام کے لیے جماعت کے اندر اتنے آدمی بھی آسانی کے ساتھ مل جائیں گے جو کام کا آغاز کر سکیں گے، پھر آہستہ آہستہ انہی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کے لیے کارکن بھی تیار ہو جائیں گے، نصاب کی تیاری میں بھی سہولت ہوگی، اور آگے کے کاموں یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی راہیں کھلیں گی۔ لیکن ہمارے یہ سارے تخمینے غلط نکلے۔ یہ اندازہ لگاتے وقت ہم سب سے زیادہ پر امید اس وجہ سے تھے کہ جنگ ختم ہو رہی تھی۔ جنگ تو بلا شبہ

ختم ہو گئی لیکن اس کی پیدا کی ہوئی زحمتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ سارا سامان تعمیر اوّل تو گراں بہت زیادہ ہے ثانیاً اس کے حاصل کرنے میں ایسی قانونی رکاوٹیں ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا صرف انہی لوگوں کے بس کا کام ہے جن کو نہ روپے کی پروا ہو نہ ایمان وضمیر کی۔ ہم ان دونوں چیزوں میں سے کسی چیز کی بھی فیاضی کے ساتھ قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے ہمارے سامنے وہ ساری مشکلیں اکٹھی ہو گئی ہیں جو ایک بگڑی ہوئی دنیا میں ان لوگوں کو پیش آیا کرتی ہیں جو اپنے اصولوں کی قربانی کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

محض تعلیمی اسکیم جاری کرنے کے خیال سے ہم نے تعمیرات کا ایک مستقل شعبہ عرصہ ہوا قائم کر دیا ہے اور ایک ذمہ دار کارکن کو، دوسری مصروفیتوں سے الگ کر کے، صرف اسی کام کے لیے خاص کر دیا ہے۔ ضرورت کی اہمیت کی وجہ سے سامان تعمیر اور لیبر (مزدور) کی غیر معمولی گرانی کا مسئلہ بھی ہم نے نظر انداز کر دیا تھا۔ صرف ایک خیال سامنے تھا کہ جس طرح اور جس قیمت پر بھی ممکن ہو، جلد سے جلد کام شروع کر دینے کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود افسوس ہے کہ تعمیر کا سلسلہ شروع ہو کر جاری نہ رہ سکا اور بہزار دقت جو سامان تعمیر مہیا ہوا اس سے بھی پورا فائدہ اٹھایا نہ جا سکا۔ یہاں ہم ایسے جنگل میں ہیں کہ آس پاس کوئی ایسی بستی بھی نہیں ہے جہاں کرایہ کے مکانات کا بندوبست کر کے کام کا کچھ سلسلہ جاری ہو سکے اور اگر یہاں سے کچھ دور ہٹ کر اس کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک بڑی دقت یہ پیدا ہو گی کہ فوراً ہمیں درسگاہ کے لیے ایک مستقل اسٹاف کی ضرورت ہو گی۔ مرکز میں کام کرنے والے حضرات سے درسگاہ کے سلسلہ میں ہم کوئی مدد نہ حاصل کر سکیں گے۔ اور یہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمارے پاس قابل اعتماد کارکن بھی کافی ہوں اور سرمایہ بھی بھرپور ہو۔ فی الحال نہ ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک وسیع اسٹاف رکھ سکیں اور نہ اتنے آدمی ہی ہیں کہ ہر شعبہ کے لیے بقدر کفایت ان کی خدمات حاصل کر سکیں۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس وقت تک کی مجبورانہ تاخیر پر صبر کیا جائے جب تک کسی قابل اعتماد تعمیری تجربہ رکھنے والے شخص کی خدمات ہم کو حاصل نہ ہو جائیں اور سامان تعمیر کی فراہمی اور مزدوروں کے ملنے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور نہ ہوں۔

تعمیر کی مشکل کے علاوہ ایک بہت بڑی مشکل ہمارے سامنے قابل اعتماد اساتذہ کی بھی ہے۔ ہمارے پیش نظر اگر محض ایک درسگاہ قائم کر دینا ہوتا تو نہایت آسانی سے ہر فن کے پڑھانے والے آدمی بکثرت مل جاتے لیکن ہم اس نصب العین کی خدمت کے لیے درسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو جماعت اسلامی کے سامنے ہے۔ اس درسگاہ کے کام کے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے فکر و عمل میں، اپنے تحقیق و تنقید کے انداز میں، اپنے طریق زندگی اور مقصد زندگی میں سو فیصدی جماعت کے نصب العین کے مطابق ہوں اور علمی و عملی دونوں اعتبارات سے ایسا ذہن اور ایسی سیرت رکھتے ہوں کہ جن لوگوں کی تربیت ان کے سپرد کی جائے ان کو پوری طرح متاثر کر سکیں۔ اس طرح کے اصحاب علم ابھی جماعت میں بہت تھوڑے ہیں اور جو ہیں ان کو مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی خود اپنی تربیت پر کافی وقت خرچ کرنا پڑے گا۔ جو اشخاص نئے علوم و افکار سے باخبر ہیں ان کے پاس مذہب کا صحیح علم اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات پر اس کی روشنی میں تنقید کر کے ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر سکیں اور جو حضرات

مذہب سے باخبر ہیں ان کو ابھی اس بات کا موقع نہیں ملا ہے کہ وہ نئے علوم و افکار کی روشنی میں اپنی معلومات کی قدر و قیمت کا اچھی طرح اندازہ کر سکے ہوں۔ ہم کو اس مشکل کا اندازہ پہلے سے تھا۔ ہم یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ہمیں اپنے مقصد کے مطابق بنے بنائے آدمی باہر سے مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم نے اس کے لیے یہ تدبیر سوچ رکھی تھی کہ جو حضرات تعلیمی اسکیم چلانے کیلئے منتخب کیے جائیں ان کو کام شروع کرنے سے پہلے ایک مدت اس مقصد کے لیے دی جائے کہ وہ مرکز میں باہمی مذاکرہ اور تبادلۂ خیالات سے علمی تعاون کی ایسی صورتیں پیدا کر لیں کہ ایک کی کمی دوسرے کی مدد سے پوری ہو سکے۔ لیکن اولاً تو ابھی تک ہم اپنے شرائط کے مطابق آدمی ہی پورے نہیں پا سکے، اور جو حضرات مل بھی سکے ہیں ان کو ابھی مکانات نہ ہونے کی وجہ سے، مرکز میں جمع نہیں کر سکے کہ وہ پیش نظر اسکیم کے لیے اپنی تیاریاں شروع کر سکتے۔

سرمایہ کی کمی بھی ہمارے سامنے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر ہمارے پاس کافی سرمایہ ہوتا تو اس میں شبہ نہیں کہ ہم کم از کم اس بات کی تو کوئی پروا نہ کرتے کہ چیزیں گراں ہیں۔ لیکن ابھی ہمارا حال یہ نہیں ہے کہ ہم کسی مقصد کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، آزادی کے ساتھ روپیہ صرف کر سکیں۔ جماعت کا تھوڑا سا سرمایہ، جو ہمارے پاس امانت ہے، ہماری کوشش یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور چونکہ جماعت کے باہر کے لوگوں سے مالی اعانت کی کوئی درخواست کرنا ہمارے اصول کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ جو قدم بھی اٹھائیں وہ جماعت کی مجموعی مالی حالت کو پیش نظر رکھکر اٹھائیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے کاموں میں جتنی دیر بھی ہو ہم اس کو گوارا کریں گے لیکن اس بات کو کبھی گوارا نہ کریں گے کہ جو لوگ ہمارے مقصد کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے ان کا سرمایہ ہماری سرپرستی کرے۔ ہمارے دل میں اس بات کی کوئی خواہش نہیں ہے کہ ہم جلد سے جلد لوگوں کو اپنا کوئی کارنامہ دکھا سکیں۔ ہماری کوشش صرف یہ ہے کہ جو کام بھی ہو اصول کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ اسی طرح کا کام موجب خیر و برکت ہوگا۔ اگر تاخیر سے گھبرا کر ہم نے اپنے اصولوں میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو ایک درسگاہ تو ضرور قائم ہو جائے گی لیکن یہ درسگاہ تجدید و انقلاب کی اس جد و جہد میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے گی جس کے لیے ہم اٹھے ہیں بلکہ الٹے اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ درسگاہ ہمارے سارے کاموں اور سارے منصوبوں کو لے کر بیٹھ جائے گی۔ ہمارے ملک میں بعض درسگاہیں نہایت اہم اصلاحی اور انقلابی مقاصد کے لیے قائم ہوئیں لیکن چونکہ ان میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ جس طرح کے ارادے ان کی تعمیر میں شریک ہیں اسی طرح کے لوگوں کا مال ان کی کفالت کا بار اٹھائے اس وجہ سے بہت جلد ان کے مزاج میں فساد آگیا اور روپیہ دینے والوں کا بلند ہاتھ روپیہ مانگنے والوں کے پست ہاتھ پر اس طرح غالب آگیا کہ وہ سارے مقاصد خاک میں مل گئے جو ان درسگاہوں کے قیام سے پیش نظر تھے۔ ہم اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اس درسگاہ کو اس تحریک کے ایک جز کی حیثیت سے اور اسی کی خاطر چلانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے دل اس تحریک میں ہمارے ساتھ ہیں انہی کی جیب اس درسگاہ کی مالی ذمہ داریاں اٹھائے تاکہ یہ درسگاہ اس طرح پروان چڑھے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی کر پروان چڑھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی جماعت کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بل پر کوئی اس طرح کا بڑا عزم کیا جا سکے لیکن ہم

اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کام کو صحیح طور پر انجام دینا مشکل ہو تو اس کو غلط ہی طور پر کرنا گوارا کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے لیے راہیں پیدا کرے گا۔

درسگاہ کے قیام میں جو دیر ہو رہی ہے اس کی ایک حد تک تلافی کے لیے ہم نے فی الحال یہ شکل سوچی ہے کہ جماعت کے کارکنوں کے لیے ایک عارضی تربیت گاہ جاری کر دی جائے۔ اس تربیت گاہ کا مقصد یہ ہوگا کہ جماعت کے کارکنوں کی ایک متعین تعداد مرکز میں قیام کر کے جماعت کے کاموں کے لیے علمی و عملی ٹریننگ حاصل کرے۔ ان کے درس و مطالعہ کے لیے ایک مختصر نصاب ہوگا۔ اور ایک خاص نظام کے ماتحت ان کو یہاں کے مختلف شعبوں کے فرائض کو سمجھنے اور انجام دینے کا موقع بہم پہنچایا جائے گا۔ اس کام کے لیے مدت کم سے کم رکھی جائے گی اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مدت میں ان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ اس وقت ہمارے پاس قیام کے لیے اتنی گنجائش ہے کہ ۱۵ - ۲۰ آدمی بیک وقت یہاں ٹھہر سکیں گے۔ اگر ۱۵ - ۱۵ آدمیوں کے کم از کم تین بیج بھی سال میں یہاں ٹھہر کر تربیت حاصل کر سکے تو بہت جلد جماعت کے اندر تجربہ کار کارکنوں کی کافی تعداد پیدا ہو جائے گی اور آئے دن تربیت نہ پائے ہوئے کارکنوں کی وجہ سے ہمیں جو زحمتیں پیش آ رہی ہیں یا دوسروں کو کبھی کبھی جماعت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، ان میں بہت بڑی حد تک کمی ہو جائے گی اور تعلیم و دعوت کی رفتار بھی تیز ہو جائے گی۔ اس چیز کی ضرورت ہماری باہر کی شاخیں بھی محسوس کر رہی ہیں اور ہم بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں لیکن ہم اس تربیت گاہ کو درسگاہ کا ایک جز بنانا چاہتے تھے اور درسگاہ کے قیام میں ہماری اسکیم کے لحاظ سے زیادہ دیر نہیں تھی اس وجہ سے اس کو ٹالتے رہے۔ اب چونکہ بظاہر حالات اس بات کی توقع نہیں ہے کہ درسگاہ اس سال جاری ہو سکے اس وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوا کہ کارکنوں کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے۔ انشاء اللہ یہی چیز درسگاہ کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اس مقصد کے لیے پھوس کا ایک مکان موجود ہے۔ صرف فرش ٹھیک ہو جائے اور ضروری سامانِ اقامت مہیا ہو جائے تو اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

سالانہ اجتماع کا وقت قریب آ رہا ہے۔ گزشتہ اجتماع کے موقع پر ہماری جن شاخوں کی طرف سے آئندہ کے اجتماع کے لیے دعوت نامے ملے تھے ان میں مدراس کی جماعت کی دعوت کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ اس اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ مرکز سے بہت دور ہونے کی وجہ سے مدراس اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ سالانہ اجتماع کے ذریعہ سے مقصد دعوت کو وہاں تقویت پہنچائی جائے یہی خیال اب تک پیش نظر رہا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مدراس میں اجتماع کرنے کی صورت میں جماعت اور ارکان جماعت کا بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوگا۔ اب تک جماعت کے ارکان کی بڑی تعداد شمالی ہند میں ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہاں کے شرکائے اجتماع کی تعداد کسی طرح بھی پانچسو سے کم نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کا امکان ہے۔ اگر ارکان کی اتنی بڑی تعداد کو مدراس جیسے دور دراز علاقہ کا سفر کرنا پڑا تو آمد و رفت کے مصارف اتنے زیادہ ہوں گے کہ لوگ بار محسوس کریں گے اور بالفرض لوگ مقصد کی محبت میں بار نہ بھی محسوس کریں جب بھی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ بغیر کسی غیر معمولی سبب کے ارکان کو اس طرح کے ایثار پر مجبور کیا جائے۔

اس وجہ سے غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ سالانہ اجتماع تو یوپی میں ہو البتہ مرکز کے کارکنوں کا ایک وفد مدراس کا دورہ کرے۔ اس صورت میں ایک طرف تو ہر صوبہ کے ارکان کے لیے سفر نسبۃً کم خرچ اور آسان ہو جائے گا، دوسری طرف مدراس کیا سالانہ اجتماع کے انعقاد سے جو غرض پیش نظر تھی وہ بھی بہتر طریق پر حاصل ہو سکے گی۔ وفد بنا کر دورہ کرنے کی صورت میں جس جزرسی اور وسعت کے ساتھ صوبہ کے حالات اور تحریک کے لیے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس جزرسی اور تفصیل کے ساتھ سالانہ اجتماع کی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے مدراس کے رفقا بھی اس تجویز کو زیادہ پسند کریں گے۔ اور یہ خیال نہ کریں گے کہ ان کی دعوت کی قدر نہیں کی گئی۔ اصل چیز مقصد ہے وہ جس صورت میں بہتر طریق پر حاصل ہو اس کے لیے جماعت کے ارکان کو اپنی انفرادی سہولتیں اور خواہشیں ہمیشہ قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ مسئلہ ابھی زیر غور ہے کہ اجتماع کے لیے یوپی کا کون سا شہر موزوں ہوگا؟ ظن غالب ہے کہ الہ آباد یا کانپور کا انتخاب ہوگا۔ اس بارہ میں یوپی کی جماعتوں سے مراسلت ہو رہی ہے۔ ان کی تجاویز آ جانے کے بعد مرکز کی طرف سے آخری فیصلہ ہوگا۔ اور اس کا ان صفحات میں اعلان کر دیا جائے گا۔

اجتماع سے متعلق ضروری ہدایات اس سے پہلے کے اجتماعات کے موقع پر دی گئی ہیں۔ اس موقع پر مزید جن ہدایات کی ضرورت سمجھی جائے گی وہ بھی شائع ہو جائیں گی۔ بروقت صرف یوپی کے ارکان جماعت سے یہ کہنا ہے کہ وہ جس حد تک اس دعوت کو پھیلانے میں کوشش کر سکتے ہوں اسے اٹھا نہ رکھیں۔ سالانہ اجتماع کا اصلی فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب اس سے پہلے ایک وسیع حلقہ کے ذہن کو اچھی طرح تحریک کے ما لہ و ما علیہ سے آشنا کر دیا جائے۔ اس کا آسان طریقہ لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جن لوگوں تک ہمارا لٹریچر پہنچ جائے گا ان میں بڑی تعداد ان شاء اللہ ایسے لوگوں کی نکلے گی جو جماعت کے نصب العین سے قریب آ جائیں گے اور سالانہ اجتماع کے موقع پر اگر ان میں سے کچھ لوگ اپنے شبہات و شکوک دور کرنا چاہیں گے تو نہایت آسانی کے ساتھ کر سکیں گے۔ درحقیقت اسی طرح کے لوگوں تک پہنچنے اور ان کے ذہنوں میں اپنے مقصد کو اتارنے کے لیے یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اجتماعات کیے جائیں۔ اگر یہ چیز مد نظر نہ ہوتی تو اجتماعات کو ہم اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر دیتے۔ اس امر سے پہلے سے اس وجہ سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ بالکل خالی الذہن ہمارے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں وہ ان سے بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ بسا اوقات اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کسی غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

تفہیم القرآن

(۳۱)

التوبہ

(از وسط رکوع ۱۳ تا وسط رکوع ۱۴)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمینگاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار رہ چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔[۱] پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے

۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلۂ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اس کے اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے تو اس کی مشیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ نعمتِ ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپ کو اپنی مشیخت کا حریف اور اپنے کاروبارِ درویشی کا دشمن سمجھ کر آپ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفارِ قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہو گی۔ لیکن جنگِ بدر میں جب قریش نے شکستِ فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ جنگِ اُحُد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ احد کے میدانِ جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گر کر زخمی ہوئے۔ پھر جنگِ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کو چڑھا لانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگِ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکینِ عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے مایوسی ہو گئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی، اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس "خطرے" سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں (باقی حاشیہ صفحہ پر)

اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔

ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہم نوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنا لیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جا سکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جا سکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے مطابق وہ مسجد تیار کی گئی جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کار ثواب ہو، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفرق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس تعمیر نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد ضرار بن کر تیار ہوئی تو یہ اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں، اور ایک بڑی مہم درپیش ہے، اس مہم سے واپس آ کر دیکھوں گا۔" اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ ادھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور ادھر یہ فوراً ہی عبداللہ ابن اُبی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب ذی اوان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱؎ متن میں لفظ "جُرُف" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی ندی یا دریا کے اس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور اوپر کا حصہ بے سہارا کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں ان کی تعمیر حیات کو یہاں اسی عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارۂ دریا پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقہ سے اس صورت حال کا نقشہ کشی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی پوری معنویت ذہن نشین کرنے کے لیے یوں سمجھیے کہ دنیا کی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن و منافق، کافر و صالح، فاجر، غرض تمام انسان کام کرتے ہیں، مٹی کی اس اوپری تہ کے مانند ہے جس پر دنیا میں ساری (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰ پر)

اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔[۱۰۵] یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔[۱۰۶] اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔ ع ۱۳

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔[۱۰۷] وہ اللہ کی راہ میں لڑتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ تو اپنے اندر خود کوئی پائیداری نہیں رکھتی، بلکہ اس کی پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو۔ اگر کوئی ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز، مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو جو ناواقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر اپنا مکان بنائے گا اُسے وہ اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کر کے اپنا جو کچھ سرمایۂ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیاتِ دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامۂ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں، بجائے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی و پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کے خوف، اُس کے حضور جوابدہی کے احساس اور اُس کی مرضی کے اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی محض حیاتِ دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر لیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہو کر کام کرتا ہے وہ دراصل خود اپنی تعمیرِ زندگی کے نیچے سے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بنیادِ سطح جس پر اس نے اپنی عمر بھر کا سرمایۂ عمل جمع کیا ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمایے سمیت لے بیٹھے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱۰۵] "سیدھی راہ" یعنی وہ راہ جس سے انسان بامراد ہوتا اور حقیقی کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

[۱۰۶] یعنی ان لوگوں نے منافقانہ مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ بھی ان میں موجود رہے گا۔ خدا سے کفر کرنے کے لیے جو شخص علانیہ بت خانہ بنائے یا اس کے دین سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا مورچے اور دمدمے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے، کیونکہ اس کے اندر راستبازی، اخلاص اور اخلاقی جرأت کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل، جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پُرفریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہی کہاں باقی رہ سکتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ سہار سکے۔

[۱۰۷] یہاں ایمان کے اُس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان طے ہوتا ہے، بیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم مضمون کے تضمنات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اُس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے، لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نہ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے، نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱ پر)

اور مارتے اور مرتے ہیں، ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ و انجیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیۃً اس کے حوالے کر دیا ہے، اور وہ ہے اس کا اختیار یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (free will + freedom of choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دیدی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زعم میں یہ خیال کرے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے، بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے، اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بمجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر اور خیانت کی جو آزادی تجھے حاصل ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کرلے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور جو شخص اس سے انکار کر دے، یا اقرار کرنے کے باوجود ویسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ وہ کافر ہے اور اس بیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کیجیے:-

(۱) اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

(۲) دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کو غیر مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان معتبر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلیۃً دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا، اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا، اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا، اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں ہے جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا (باقی صفحہ ۱۲ پر)

اور قرآن میں۔[108] اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا، یہ دونوں طرز عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعی ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ بیچا نہیں ہے، یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بیچی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

(۳) ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویۂ زندگی اور کافرانہ رویۂ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو، اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا۔ الا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ، اہل ایمان کا مرکب ہو وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرز تمدن و تہذیب، کوئی طریق معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا، اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبہ ہو اسی وقت وہ آزادی کا رویہ چھوڑ کر بندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقات نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، بہرحال ایک کافرانہ رویۂ زندگی ہے خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

(۴) اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع مومن پر لازم آتا ہے وہ اس کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھیرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدۂ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویۂ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تضمنات ہیں، اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا" بلکہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیچی ہوئی چیز پر خود مختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے"۔ لہٰذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہوگی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحہ تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ از روئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا، مگر جب امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے بعض نے تساہل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے، اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو، اور اپنے نفس کی قوتوں کو، نیز اپنے ذرائع کو اس کے منشا کے خلاف استعمال کرتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچے اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں، جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انہیں بے دریغ قربان کرتے ہیں، اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی ادنیٰ سا جز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [108] اس امر پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ توراۃ اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک (باقی صفحہ ۱۳ پر)

سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے[۵۱]، اس کی بندگی بجا لانے والے، اس کی تعریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو اناجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں، مثلاً:

"مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے" (متی ۵: ۱۰)

"جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا" (متی ۱۰: ۳۹)

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔" (متی ۱۹: ۲۹-۳۰)

البتہ توراۃ جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا، اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لاینفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ توراۃ میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی توراۃ اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانۂ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتاب الٰہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر توراۃ میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:-

"سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر" (استثناء ۶: ۴-۵)

لیکن اس عمل کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اُس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ توراۃ جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے وہ خالص کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام بھی خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، اور یہودیوں کی قومی روایات، ان کے نسلی تعصبات، ان کے اوہام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں، اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلۂ عبارت میں کلام الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے تمیز کرنا قطعاً غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۵۱] متن میں لفظ التَّائِبُوْنَ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ "توبہ کرنے والے" ہے۔ لیکن جس انداز کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ کرنا اہل ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ توبہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ اور توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے یا پلٹنے کے ہیں، لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تشریحی ترجمہ یوں کیا ہے کہ "وہ اللہ کی طرف بار بار پلٹتے ہیں"۔ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس و مال کی بیع کا معاملہ طے کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ نفس اس کا اپنا ہے اور مال اس کا اپنا ہے، اور یہ بات کہ اس نفس و مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک امر محسوس نہیں بلکہ محض ایک امر معقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے معاملۂ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود مختارانہ طرز عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر گزرا ہے تو (باقی صفحہ ۱۴ پر)

کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے[1]، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے[2]، (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی ان مومنوں کو خوشخبری دیدو۔

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں[3]۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳) اسے ندامت لاحق ہوتی ہے اور شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدا کی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے، اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے، ورنہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک دفعہ نفس و مال بیچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں اس بیع کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی غفلت و نسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر کبھی اس سے پھسلتا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی قابل تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پھسل پھسل کر بار بار اسی راہ کی طرف آتا ہے، اور یہی وہ بڑی سے بڑی خوبی ہے جس پر انسان قادر ہے۔

پھر اس موقع پر مومنین کی صفات میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر کرنے کی ایک اور مصلحت بھی ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اس میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن سے ایمان کے منافی افعال کا ظہور ہوا تھا۔ لہٰذا ان کو ایمان کی حقیقت اور اس کا بنیادی مقتضیٰ بتانے کے بعد اب یہ تلقین جاری ہے کہ ایمان لانے والوں میں لازمی طور پر جو صفات ہونی چاہئیں ان میں سے اولین صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کا قدم راہ بندگی سے پھسل جائے وہ فوراً اس کی طرف پلٹ آئیں، نہ یہ کہ اپنے انحراف پر جمے رہیں اور زیادہ دور نکلتے چلے جائیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] متن میں لفظ السائحون استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصائمون (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے، لیکن سیاحت کے معنی روزہ، مجازی معنی ہیں، اصل لغت میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں، اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لفظ کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں اس کی نسبت حضورؐ کی طرف درست نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس لفظ کو اصل لغوی معنی ہی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خرچ کرنے کے ہیں، اور مراد اس سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے، اسی طرح یہاں بھی سیاحت سے مراد محض گھومنا پھرنا نہیں ہے بلکہ ایسے مقاصد کے لیے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جو پاک اور بلند ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو۔ مثلاً اقامت دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین، اصلاح خلق، طلب علم صالح، مشاہدۂ آثار الٰہی اور تلاش رزق حلال۔ اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار پر گھروں سے نہیں نکلے تھے ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ حقیقی مومن ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کا بول بالا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دنیا میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتا پھرتا ہے۔ [2] یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت اور صلح و جنگ کے معاملات میں جو حدیں مقرر کر دی ہیں وہ ان کی پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں، اور کبھی ان سے تجاوز کر کے من مانی کارروائیاں کرنے نہیں لگتے ہیں، اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ حدود کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ان حدود کو قائم کیا جائے، انھیں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ لہٰذا سچے اہل ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں بلکہ مزید برآں ان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نگہبانی کرتے ہیں، اور اپنا پورا زور اس سعی میں لگا دیتے ہیں کہ یہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔

[3] کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابل معافی (باقی صفحہ ۲۱۴)

وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا[۱۲۵]، مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا[۱۲۶]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو، لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو" بلکہ یوں فرمایا ہے کہ "تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو"۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں، تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلہ رحمی، مواساۃ، اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی، حاجت مند آدمی کو بہر صورت سہارا دیا جائے گا، بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا، اور ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱۲۵] اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیم نے کہی تھی کہ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم۔ ۳) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے"۔ اور لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (الممتحنہ۔ ۱) "میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوا لوں"۔ چنانچہ اسی وعدے کی بنا پر آنجناب نے اپنے باپ کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ: وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء۔ ۵) "اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا نہ کر جبکہ سب انسان اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد، نجات صرف وہ پائے گا جو اپنے خدا کے حضور بغاوت سے پاک دل لے کر حاضر ہوا ہو"۔ یہ دعا اول تو خود انتہائی محتاط تھی، مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیم کی نظر اس طرف گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کھلم کھلا باغی تھا اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا تو وہ اس سے بھی باز آ گئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انہوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبریٰ کر دی، اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو پالا پوسا تھا۔

[۱۲۶] متن میں اوّاہ اور حلیم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اوّاہ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور تعلق خاطر میں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوہرے معنی دے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا، اور حلیم تھے، اس ظلم و ستم کے باوجود جو ان کے باپ نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انھیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انھیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے[۱۱۵]۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے، اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے، اور تمھارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمھیں اس سے بچا سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱) اسلام سے ان کو روکنے کے لیے اُن پر ڈھاتے تھے ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبرّی کی کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کر جانے والے نہ تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱۱۵] یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ لوگوں کو کن خیالات، کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ نہیں باز آتے اور غلط فکری و غلط کاری ہی پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اس غلط راہ پر انھیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔

یہ ارشاد ایک قاعدۂ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن مجید کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں جہاں ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ خدا کا ہدایت دینا یہ ہے کہ وہ صحیح طریق فکر و عمل اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دیتا ہے۔ پھر جو لوگ اس طریقہ پر خود چلنے کے لیے آمادہ ہوں انھیں اس کی توفیق بخشتا ہے۔ اور خدا کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر کوئی اصرار کرے، اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو خدا اس کو زبردستی راست بیں اور راست رو نہیں بناتا بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔

اس خاص سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مناسبت سے بیان ہوئی ہے وہ پچھلی تقریر اور بعد کی تقریر پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے جو نہایت موزوں طریقے سے پچھلے بیان کا خاتمہ بھی قرار پا سکتی ہے اور آگے جو بیان آ رہا ہے اس کی تمہید بھی۔

ایک گذارش

خریدار حضرات جب بھی خط و کتابت کریں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ حوالہ نہ دینے کی صورت میں تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔

"منیجر"

مقالات

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

مترجمہ مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزانِ حق و عدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کرسکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وہ قدرتِ بیان عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کردوں کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہ جائے۔ بعدازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابرین ملت کے درمیان اختلاف کی ـــ خاص کر احکام فقہیہ میں اختلاف کی ـــ وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور سائل کی قوتِ فہم و حفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن ان حقائق کا، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے، ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہوگیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہوگیا جس کا نام میں نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" رکھا۔

دورِ نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدوّن نہیں تھی، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کرکے ایک ایک چیز کے علیحدہ علیحدہ ارکان و شرائط اور آداب، دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جاسکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں، اور جن کا حصر بیان کیا جاسکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذلک۔ اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقۂ وضو دیکھ کر اسے اختیار کرلیتے، بغیر اس کے کہ حضور اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپکے نماز پڑھنے کا ڈھنگ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے۔ آپ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپکے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے۔ الغرض آنحضرت صلعم کا عام طریقۂ تعلیم یہی تھا۔ آپ نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ، اور نہ کبھی آپنے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے اس لیے اس طرح کے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے۔ اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے۔ دوسری طرف اصحاب رسولؐ کا بھی حال یہ تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے

متعلق آنحضرت صلعم سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا۔ انھوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ (اے نبی یہ لوگ تم سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔) اور يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ (تم سے حالت حیض کے احکام پوچھتے ہیں) وغیرہ۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ "صحابہ صرف انہی مسائل کو پوچھتے تھے جو ان کے لیے نفع رساں ہوتے۔" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "کسی ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو کیونکہ میں نے عمرؓ بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو اس طرح کے سوالات کرے۔" قاسمؒ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "تم لوگ ایسی چیزوں کی بابت سوال کرتے ہو جن کی بابت ہم نے کبھی زبان استفسار نہیں کھولی۔ نیز تم ایسی باتوں کی کھود کرید کرتے ہو جن کے متعلق مجھے کوئی علم و واقفیت نہیں، اور اگر ہم کو ان کے بارے میں کوئی علم ہوتا تو (حسب فرمانِ نبویؐ[1]) ہم تمھیں ضرور بتا دیتے۔" عمر بن اسحاق کا قول ہے کہ "مجھ کو آدھے سے زائد اصحاب رسول سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اس گروہ سے بڑھ کر کسی گروہ کو اینچ پینچ سے خالی اور تشدد سے مجتنب نہیں پایا۔" عبادہ بن نسر کندی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کو غسل کیونکر دیا جائے گا؟" آپ نے جواب دیا کہ "میں ایسے لوگوںؓ[2] سے ملا ہوں جو تمھاری طرح تشدد نہیں کرتے تھے نہ تم لوگوں کی طرح (فرضی) مسائل کے متعلق سوالات کرتے تھے۔" (ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے)

الغرض آنحضرت صلعم کے زمانہ میں استفتا، اور افتا کا دستور صرف یہی تھا کہ لوگ پیش آمدہ واقعات کے متعلق آپ سے استفسار کرتے اور آپ ان کا حکم بیان فرما دیتے۔ اسی طرح معاملات و مقدمات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ ان کا فیصلہ کر دیتے۔ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی مدح و منقبت فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے

شیخین کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ساری باتیں بالعموم اجتماع عام میں ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ جب حضرات شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کو کسی مسئلہ میں حکم شریعت معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی (یا نانی) کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس کے حصہ کے بارے میں رسول اللہ کا کوئی ارشاد نہیں سنا ہے، اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں۔" جب نماز ظہر آپ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟" مغیرہؓ ابن شعبہ نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا ہے" پوچھا "کیا سنا ہے"؟ جواب دیا کہ "رسول خدا نے جدہ کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے" حضرت ابو بکرؓ نے پھر پوچھا "یہ بات تمھارے سوا اور کسی کو بھی معلوم ہے" محمد بن سلمہؓ نے کہا "مغیرہؓ صحیح فرماتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو (جس کا معاملہ پیش تھا، اس کے پوتے یا نواسے کے

---

[1] آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ اس عالم کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالی جائے گی جو کسی چیز کا علم رکھتا ہو مگر پوچھنے والے کو بتانے سے انکار کرے۔

[2] مراد صحابہ کرام سے ہے۔ (مترجم)

ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دے دیا۔ اسی طرح "غرہ" (جنین کے خوں بہا[۱]) کے بارے میں حضرت عمرؓ کا عام لوگوں سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہ کی روایت پر عمل پیرا ہونا اور وبا[۲] کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بیان کردہ ارشاد نبوی کے مطابق فیصلہ کرنا، مجوسیوں[۳] کے معاملہ میں دینی عبدالرحمٰن ابن عوف کی بیان کی ہوئی حدیث پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھنا، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ[۴] کا معقل بن یسار کی روایت، جو ان کی رائے کے بالکل مطابق نکلی سن کر خوش ہونا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری[۵] کا فاروق اعظمؓ کے دروازے سے واپس جانے کے بعد ان کا ابوموسیٰ سے اس حدیث کا دریافت کرنا جس کی بنا پر وہ ان کے دروازہ سے واپس چلے گئے تھے، اور پھر حضرت ابوسعید کا حضرت ابوموسیٰ کے حق میں شہادت دینا وغیرہ بے شمار واقعات مشہور و معروف اور صحیحین اور سنن کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بنائے اختلاف مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مبارک بالعموم یہی تھا کہ آپ مسائل و احکام شرع مجامع عام میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اب ہر صحابی نے آپ کی عبادت کے انہی طریقوں، آپ کے انہی فتووں اور فیصلوں کو یاد کر لیا جن کو اسے دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہوا، پھر ان میں سے ہر حکم کی قرائن حال پر نظر ڈال کر، علت متعین کی اور موقع و محل کے ان قرائن و علامات کو سامنے رکھ کر جو اس کے نزدیک تعیین علت و مقصد کے لیے کافی اور اطمینان بخش تھے۔ اس نے کسی حکم کو اباحت پر محمول کیا، کسی کو استحباب پر اور کسی کو نسخ پر۔ اس باب میں ان لوگوں کا اعتماد صرف اپنے اطمینان قلب اور شرح صدر پر تھا، استدلال کے (پر پیچ منطقیانہ) طریقوں سے ان کے ذہن آشنا نہ تھے، جیسا کہ تم دیہاتی باشندوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگوؤں کا مدعا سمجھتے جاتے ہیں (ان گفتگوؤں کے دوران میں استعمال کیے ہوئے) اشارات و کنایات اور تصریحات سے ان کے دلوں کو فہم مطالب کے سلسلے میں اس طرح طمانیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

---

۱ حضرت عمرؓ کے سامنے جنین کے خونبہا کا مسئلہ آیا تو چونکہ آپ کو اس بارے میں کوئی نص شرعی معلوم نہ تھی اس لیے آپ نے صحابہ سے مشورہ اور استفسار کیا۔ مغیرہ ابن شعبہ نے فرمایا کہ "پیغمبر صلعم نے اس کا خوں بہا 'غرہ' مقرر کیا ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

"غرہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، یا جنین کے ولی کو پچاس دینار یا پانچ سو درہم دیے جائیں۔

۲ حضرت عمرؓ کے واقعۂ سفر شام کی طرف اشارہ ہے جبکہ آپ شام پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر لیے جا رہے تھے اور راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آ کر یہ روایت بیان کی کہ آنحضرتؐ نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

۳ حضرت عمرؓ اپنے زمانۂ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے یہ بتایا کہ آنحضرتؐ ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو آپ نے بھی ان پر جزیہ لگا دیا۔ ۴ یہ ایک ایسی عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر اس حال میں مر گیا تھا کہ ابھی نہ تو اس نے اس کا مہر مقرر کیا تھا نہ اس سے مقاربت کی تھی۔ اس واقعہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ ۵ حضرت ابوموسیٰ حضرت عمرؓ کے دروازے پر گئے اور جب تین بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب اندر سے نہ ملا تو واپس چلے۔ چند قدم گئے ہوں گے کہ حضرت عمرؓ نے خادم سے کہا کہ ان کو اندر بلا لو، مگر خادم نے باہر آ کر ابوموسیٰ کو دروازہ پر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکار کر بلوایا اور واپس جانے کی علت پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جب تین آوازیں دینے کے باوجود اجازت نہ ملے تو دروازہ سے ہٹ جاؤ"۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اپنی اس روایت پر کوئی گواہ ... ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ چنانچہ جب حضرت ابوسعید خدریؓ نے ابوموسیٰ کی توثیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم کر لیا۔ (مترجم)

آغاز اختلاف

عہد رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد یہ حضرات مختلف اطراف و ممالک میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ خطۂ ارض میں عوام کا رہنما بن گیا۔ اب ان کے سامنے زندگی کے بے شمار واقعات اور مسائل پیش ہونے شروع ہوئے جن میں ان سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ ہر صحابی ان کے جواب میں اپنی مخصوص معلومات یا اپنے استنباط کے مطابق جوابات دیتا، اگر اس کو اپنے ذخیرۂ معلومات و استنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی تھی اور جس مقام پر اس کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم لگا دیتا۔ مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول خدا صلعم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اب یہاں سے ان کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوتا ہے جس کی مختلف بنیادیں تھیں:۔

(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف

ایک یہ کہ ایک صحابی نے رسول اکرم سے کسی معاملہ کا فیصلہ یا کوئی فتویٰ سن رکھا تھا لیکن دوسرا اس سے نابلد تھا اس لیے اس نے اس امر میں اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ پھر اس کی بھی چند صورتیں تھیں۔

اولاً یہ کہ یہ اجتہاد حدیث نبوی کے عین مطابق نکلا۔ جس کی مثال وہ روایت ہے جس کو امام نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے ایک ایسی عورت کے (حق مہر وغیرہ کے بارے میں) استفسار کیا گیا جس کا شوہر مہر مقرر کرنے اور اس سے مقاربت کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا، آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملہ میں پیغمبر صلعم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ مہینہ بھر ان کے ہاں آتے اور اصرار کرتے رہے کہ کوئی حکم بیان کر دیں۔ تب انھوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ دے دیا کہ اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیے جتنا اس کی ہم مرتبہ عورتوں کا ہوا کرتا ہے، نہ کم نہ زیادہ، نیز اس کو عدت گزارنی ہوگی اور شوہر کے ترکہ میں سے حصہ پائے گی۔ یہ سن کر معقل بن یسارؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ویسا ہی حکم دیا تھا۔" حضرت ابن مسعودؓ کو یہ معلوم کر کے اتنی مسرت ہوئی کہ شرف باسلام ہونے کے بعد سے اب تک ایسی مسرت ان پر کبھی بھی طاری ہوئی تھی۔

ثانیاً یہ کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس سلسلہ میں اس طریقہ سے کوئی حدیث نبوی سامنے آئی جس سے اس کی صحت کا ظن غالب ہوتا تھا۔ اس لیے مجتہد نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث رسول کو اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر اس روایت کو لے لو جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا خیال تھا کہ جو شخص طلوع صبح کے وقت جُنبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا، لیکن جب کچھ ازواج مطہرات نے رسول اللہ کا عمل اس خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو پہنچی مگر ایسے قابل اطمینان طریقے سے نہیں پہنچی کہ اس کے صحیح ہونے کا گمان غالب ہوتا، اس لیے مجتہد نے حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے اپنے اجتہاد ہی پر عمل کیا۔ اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول (یعنی صحاح ستہ کے مولفین) نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ "فاطمہ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آکر کہا کہ "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، رسول اللہ صلعم نے نہ تو مجھ کو زمانہ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان۔" آپ نے اس کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

(حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ تین طلاقیں پانے والی عورت کو نفقہ بھی ملنا چاہیے اور قیام گاہ بھی۔ نیز فاطمہ بنت قیس کے قول "لا نفقۃ لھا و لا سکنیٰ" کو سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی۔"

دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ "عمرؓ بن خطاب کا خیال تھا کہ اگر جُنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہم سفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہو گئی، لیکن پانی نہ پا سکا، اس لیے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا، (یہ کہتے ہوئے) آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا۔ ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھیری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقہ میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہو گئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا اس لیے لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

رابعاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو حدیث سرے سے پہنچی ہی نہیں۔ مثلاً مسلم کی یہ روایت کہ "حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سروں کے بال کھول لیں۔ حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ تعجب ہے ابن عمر پر کہ وہ عورتوں کو بال کھول ڈالنے کا حکم دیتے ہیں! اگر ایسا ہی ہے تو سیدھے سیدھے یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہ اپنے سر ہی منڈوا ڈالیں! حالانکہ میں اور رسول اللہ صلعم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور میں اپنے بالوں کے معاملہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی کہ ان پر تین بار پانی بہا دیتی تھی (اور کبھی ان کو کھولتی نہیں تھی)

دوسری مثال امام زہری کے بیان کردہ اس واقعہ میں ہے کہ "ہند کو یہ اطلاع نہ تھی کہ آنحضرتؐ نے مستحاضہ کو استحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور (ترک نماز کے غم سے) رویا کرتیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۰) لہ قرآن مجید کی آیت وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ اور آیت أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو زمانۂ عدت تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے بلکہ شوہر پر لازم ہے کہ اتنے وقت کے لیے اس کے لیے مکان مہیا کرے۔ پھر آیت وَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عورت کو زمانۂ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیے۔ یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل مطلق اور عام ہیں، ان میں طلاق رجعی والی عورت کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے، اس لیے ان کا حکم ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کے حق میں عام اور نافذ العمل ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کر دی کیونکہ وہ آیات قرآنی کے خلاف پڑتی تھی۔

یہیں سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی۔ ظاہر ہے فاطمہ صحابیہ تھیں۔ اصول حدیث کی رو سے "الصحابۃ کلھم عدول" سے خارج نہ تھیں، لیکن اس کے باوجود جب قرآن کے متبادر مفہوم سے ان کی روایت ٹکرائی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ احادیث میں صرف سند ہی قابل لحاظ شے نہیں ہے بلکہ متن بھی دیکھا جانا چاہیے۔ سند بالکل سلسلۃ الذہب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حدیث میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ سند کی صحت، صحت حدیث کو مستلزم نہیں۔ آخر فاطمہ بنت قیس کی روایت میں ضعف اسناد کا کون سا احتمال تھا۔ (مترجم)

(۲) فعل رسول کی تعیین نوعیت میں اختلاف

اختلاف صحابہ کی دوسری اساس یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کام کرتے تو سب نے دیکھا (مگر افکار بشری میں فطری تفاوت کی وجہ سے اس فعل کی نوعیت کی تعیین میں اختلاف ہو گیا) پھر کسی نے تو اس فعل رسول کو عبادت سمجھا اور کسی نے اس کو صرف اباحت پر محمول کیا۔ مثلاً "تحصیب" یعنی سفر حج میں ابطح (نامی وادی مکہ) میں آنحضرت کا اترنا۔ اس کو اصحاب اصول نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم اس جگہ نزول فرما ہوئے تھے، مگر یہ نزول حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کے نزدیک بحیثیت عبادت تھا، اس لیے یہ لوگ اس کو حج کی سنتوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے خیال میں اترنا محض بطور اتفاق تھا نہ کہ کسی سنت کی ادائگی کی حیثیت سے۔

دوسری مثال:۔

"جمہور کے نزدیک خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت رَمَل، یعنی اکڑ کر چلنا سنت ہے، لیکن حضرت ابن عباس کا فرمانا یہ ہے کہ نبی صلعم نے جو رمل کیا تھا وہ محض اتفاقی طور پر اور عارضی سبب سے تھا، یعنی مشرکین مکہ کا یہ طعن کہ "مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے بالکل چور کر ڈالا ہے۔" (اسی طعن کے جواب میں پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا وقتی حکم دیا تھا ورنہ) یہ فعل حج کی کوئی مستقل سنت نہیں ہے۔

(۳) وہم تعبیر کا اختلاف

تیسری اساس اختلاف یہ ہے کہ افعال رسول کے بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف گمانوں سے کام لیا۔ مثلاً:۔

"رسول خدا صلعم نے حج ادا فرمایا اور تمام صحابہ نے اس کا مشاہدہ کیا، لیکن اس حج کی نوعیت بیان کرتے وقت کسی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے حج تمتع[1] کیا تھا، کسی نے کہا آپ نے حج قِران[2] ادا کیا تھا اور کسی کا خیال یہ تھا کہ آپ کا حج حج افراد[3] تھا۔"

دوسری مثال، حضرت سعیدؒ ابن جبیر کی روایت، جس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ:۔

"میں نے (حضرت سعیدؒ نے) عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اے ابوالعباسؓ! اس اختلاف کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے جو رسول اللہ صلعم کے احرام حج باندھ لینے کے بعد تلبیہ[4] کرنے کے متعلق اصحاب رسول میں موجود ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے صرف ایک ہی حج ادا فرمایا اس لیے لوگوں میں اس کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہو گیا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم حج کی خاطر مدینہ سے چلے اور جب مسجد ذی الحلیفہ میں آپ نے دوگانہ احرام ادا فرمایا تو اسی جگہ حج کا احرام باندھا اور فوراً تلبیہ کیا۔ اس تلبیہ کی آواز کچھ لوگوں کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے اس کو یاد کر لیا۔ اس کے بعد آپ اونٹنی پر سوار ہو گئے، جب اونٹنی آپ کو لے کر اٹھی تو آپ نے پھر تلبیہ کیا اور اس تلبیہ کو بھی کچھ دوسرے لوگوں نے سنا۔ بات یہ تھی کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت رسالت میں چلے آتے

---

[1] حج تمتع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں جا کر عمرہ ادا کرے اور سر منڈا کر احرام کھول دے۔ پھر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو از سر نو حج کا احرام باندھے اور حج ادا کرے۔ [2] قران کی شکل یہ ہے کہ آدمی عمرہ اور حج دونوں کا احرام بیک وقت باندھے اور دونوں کو ادا کر کے احرام کھول دے۔

[3] افراد مطلق حج ادا کرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

[4] تلبیہ حج یہ ہے:۔ لبیک، اللّٰھم لبیک، لبیک، لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لاشریک لک۔ (مترجم)

تھے، سو جب ایک گروہ نے اونٹنی کے کھڑے ہونے کے وقت آپ کو تلبیہ کرتے سنا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ رسول اللہ صلعم نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب ناقہ آپ کو لے کر اٹھی۔ پھر آنحضرت اس جگہ سے آگے بڑھے، جب بیدا (نامی مقام) کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے پھر تلبیہ کیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کو یہ تلبیہ کرتے ہوئے سنا اور یہ خیال کر بیٹھے کہ آپ نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب بیدا کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ حالانکہ بخدا آپ نے اپنی جائے نماز ہی پر حج کی نیت کر لی تھی اور جب آپ کو لے کر اونٹنی کھڑی ہوئی اس وقت بھی آپ نے تلبیہ کیا اور جب بیدا کی بلندی پر چڑھے اس وقت بھی کیا۔

(۴) سہو و نسیان کا اختلاف اختلاف صحابہ کی چوتھی اساس سہو و نسیان ہے۔ جس کی مثال حضرت ابن عمرؓ کے متعلق اس روایت میں موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ابن عمرؓ کو سہو ہو رہا ہے (آنحضرت نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا)

(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف پانچویں اساس، ارشاد نبوی کے مقصود کے فہم و ضبط کا اختلاف ہے۔ مثلاً جب حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت بیان کی کہ "میت کے پسماندگان کے نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا کہ "ابن عمرؓ نے ارشاد رسالت کو اس کے اپنے صحیح موقع و محل اور مدعا کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک یہودی عورت کی قبر سے گزرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ و ماتم کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے"۔

(دیکھو کہ واقعہ کس طرح ایک خاص میت سے متعلق تھا لیکن قول رسول کے اس خصوصی محل کو ذہن سے نکال دینے کے باعث ابن عمرؓ اعزہ کی گریہ وزاری ہی کو میت پر عذاب کی علت گمان کر بیٹھے اور اس بات کو انھوں نے ہر میت کے لیے ایک عام اصول کی حیثیت دیدی۔

(۶) تعیین علت کا اختلاف چھٹی اساس صحابہ کا احکام شرع کی تعیین علت میں مختلف الخیال ہو جانا ہے۔ جیسے جنازہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا مسئلہ۔ بعض صحابہ کا کہنا یہ ہے کہ ایسا فرشتوں کی تعظیم میں کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ ہر جنازہ کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں) تو اس خیال کے مطابق ہر جنازہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے، خواہ مومن کا جنازہ ہو یا کافر کا۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ یہ قیام، موت کے ہول کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں بھی یہ حکم قیام ہر جنازہ کے لیے عام ہوگا۔ لیکن کچھ حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت صلعم کے قریب سے گذرا تو آپ کو اس بات سے تنفر ہوا کہ ایک یہودی لاش میرے سر سے اونچی ہو کر گذرے اس لیے آپ کھڑے ہو گئے۔ اگر اس علت قیام کو صحیح مانا جائے تو یہ قیام صرف جنازۂ کفار کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۷) مطابقت احکام مختلفہ میں اختلاف ساتویں اساس، صحابہ کا وہ اختلاف رائے ہے جو دو مختلف احکام شرع کے درمیان مطابقت دینے میں پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ جنگ خیبر کے موقع پر آنحضرت نے متعہ کی اجازت دی، بعد میں اس کی ممانعت کر دی۔ پھر جنگ اوطاس کے زمانہ میں دوبارہ یہ رخصت عطا فرمائی۔ اس کے بعد پھر اس سے روک دیا۔ اب حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ اجازت دی گئی تھی اور جب ضرورت جاتی رہی تو یہ اجازت بھی واپس لے لی گئی، مگر حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ لیکن جمہور کا یہ کہنا ہے کہ یہ رخصتِ متعہ بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال :-

"رسول اکرم صلعم نے استنجا کرتے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے متعلق صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم بالکل عام اور غیر منسوخ ہے۔ لیکن حضرت جابرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب کرتے دیکھا۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ آپ کے اس فعل نے اس پہلی ممانعت کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت کو قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کرکے قضائے حاجت فرماتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے آنحضرت کے اس فعل سے ان لوگوں کے قول کی تردید فرمائی (جو کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف پشت کرکے استنجا کرنا شرعاً ممنوع ہے) پھر کچھ لوگوں نے دونوں روایتوں کو بر[illegible]نے کی سعی کی۔ سو شعبی وغیرہ نے یہ رائے قائم کی کہ نہی کھلے میدانوں سے مخصوص ہے۔ لیکن اگر آدمی پاخانہ کے اندر ہو تو اس کے لیے قبلہ کی طرف پشت یا رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور بعض دوسرے حضرات اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرت کا قول (جس میں نہی موجود ہے) اپنی جگہ بالکل قائم و ثابت ہے اور اس کا حکم عام ہے۔ رہ گیا آپ کا فعل، سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے مخصوصات میں سے ہو، اس طرح یہ فعل، ارشاد نبوی کا نہ تو ناسخ ہوگا نہ مخصص۔

عہد تابعین الغرض اس طرح صحابہ کرام کے مذاہب مختلف ہو گئے۔ پھر یہی اختلافات وراثتاً تابعین تک پہنچے۔ ہر تابعی کو جو کچھ مل سکا اسی کو اس نے اپنا لیا اور آنحضرتؐ کی جو حدیثیں اور صحابہ کے جو مذاہب اس نے سنے ان کو محفوظ اور ذہن نشین کر لیا۔ اور جو مختلف اقوال اس کے سامنے آئے اس نے اپنی فہم کی حد تک ان میں مطابقت پیدا کی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض اقوال ان کی نگاہوں میں بالکل ہی ناقابل اعتنا ہو کر رہ گئے، اگرچہ وہ اجلۂ صحابہ سے مروی تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ و ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ جنابت کے لیے تیمم نہیں ہے، تابعین تک پہنچا مگر ان احادیث کی بنا پر ان کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا، جو عمارؓ اور عمران بن حصین وغیرہ اصحاب سے مروی ہو کر مشہور ہو چکی تھیں۔ پس اس حالت میں قدرتی طور پر علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا علیحدہ مذہب ہو گیا اور مختلف شہروں میں مختلف ائمہ کی علیحدہ علیحدہ امامتیں قائم ہو گئیں مثلاً مدینہ میں سعید ابن مسیب اور سالم ابن عبداللہ عوام کے مرجع و امام بن گئے، پھر ان کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ ابن سعید اور ربیعہ ابن عبدالرحمٰن نے یہ حیثیت حاصل کی۔ مکہ میں عطاء ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی نے مسند امامت سنبھالی۔ اسی طرح حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں اور مکحول شام میں پیشوائے دین اور ترجمان شرع تسلیم کیے گئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں میں ان حضرات کے علوم و معارف کی پیاس پیدا کی اور انھیں ان علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ان علمائے کبار سے رسول اللہ کی حدیثیں صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور خود ان کے اپنے مذاہب اور تحقیقات لے کر جمع کیں، پوچھنے والوں نے ان سے فتوے پوچھے (زندگی کے بے شمار) مسائل ان کے سامنے آئے اور کتنے ہی معاملات ان کے روبرو پیش ہوئے۔ (جن میں انھیں فتوے دینے پڑے)

تدوین فقہ کی ابتدا سعید ابن مسیب اور ابراہیم نخعی وغیرہ نے باقاعدہ فقہ کے تمام ابواب جمع کیے۔ ہر باب میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتے تھے جن کو انھوں نے سلف سے حاصل کیا تھا۔

سعید ابن مسیب اور ان کے تلامذہ اس امر کے قائل تھے کہ حرمین کے باشندے تفقہ میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

اس لیے ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ اور احکام نیز حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتووں اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں پر قائم ہے۔ چنانچہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی انھوں نے ان احکام اور فتاویٰ کو جمع کیا۔ پھر ان پر بصیرت اور تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان کا جائزہ لیا، جس شے پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اس پر تو پوری مضبوطی سے جم گئے، اور جس چیز میں ان کا اختلاف دکھائی دیا اس کے متعلق وہ قول اختیار کر لیا جو زیادہ قوی اور راجح تھا۔ یہ قوت اور ارجحیت خواہ کسی بنا پر ہو، چاہے اس بنا پر کہ اکثر علما کا اختیار کردہ قول ہے، یا اس بنا پر کہ وہ کسی مضبوط قیاس یا کتاب و سنت کے کسی صریح استنباط کے موافق پڑتا ہے، یا کسی اور بنا پر۔ اور جب ان لوگوں کو علمائے مدینہ سے حاصل کیے ہوئے مجموعۂ فتاویٰ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تو ان کے فرمودات سے استنباط کرتے اور ان کے اقوال کے اشارات اور مقتضیات کا سراغ لگاتے۔ اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب کے متعلق مسائل کا انبار لگ گیا۔

ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کا خیال تھا کہ عبد اللہ ابن مسعودؓ اور ان کے فیض یافتگان فقاہت میں سب سے ممتاز ہیں جیسا علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ "کیا کوئی صحابی عبد اللہ ابن مسعودؓ سے بھی بڑا فقیہ ہے؟" نیز امام ابو حنیفہ نے امام اوزاعی سے فرمایا کہ "ابراہیم نخعی، سالم ابن عبد اللہ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر عبد اللہ ابن عمر کو صحابیت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں۔ رہے عبد اللہ ابن مسعودؓ تو وہ تو عبد اللہ ابن مسعود ہی ہیں، ان کا کیا پوچھنا۔" ان حضرات کے مسلک فقہی کی بنیاد حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور حضرت علی کے فتووں اور فیصلوں پر، نیز قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے اپنے مقدور بھر ان احکام و فتاویٰ کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جو سعید بن مسیب وغیرہ نے علمائے مدینہ کے آثار و اقوال کے متعلق اختیار کیا تھا، نیز اس ذخیرہ سے اسی طرح مزید مسائل کی تخریج کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔ انجام کار ان کے پاس بھی فقہ کے ایک ایک باب میں بے شمار مسائل منضبط ہو گئے۔

سعید ابن مسیب فقہائے مدینہ کے نفس ناطقہ اور ان میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابو ہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ اور ابراہیم نخعی فقہائے کوفہ کے ترجمان۔ جب یہ دونوں حضرات کسی کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ مسئلہ کسی کی طرف منسوب نہیں اور بہر حال ان کا اپنا ہی اجتہاد ہے، بلکہ ایسے مسائل بالعموم کسی نہ کسی فقیہ سابق سے اشارۃً یا صراحۃً ضرور منسوب ہوتے ہیں، بالآخر یہ دونوں اپنے اپنے قرب و جوار کے فقہا کا مرکز بن گئے جنھوں نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا، اس میں تفکر کیا اور اس سے مزید مسائل اور جزئیات نکالے۔

مذاہب فقہا کے اسباب اختلاف

تبع تابعین کا دور عہد تابعین کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے خدام علم دین کا ایک گروہ پیدا کر دیا تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو اللہ کے رسول کی زبان سے اس علم کے متعلق نکلا تھا کہ "آنے والی نسلوں میں سے ہر نسل کے عادل لوگ اس علم کے حامل ہوں گے۔" چنانچہ ان خدام نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ان علمائے تابعین سے، جن سے وہ مل سکے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، بیع و شرا وغیرہ ان تمام مسائل کے جو زندگی میں عام طور سے پیش آتے ہیں، مشروع طریقے اخذ کیے، رسول خدا کی حدیثیں نقل کیں، مختلف شہروں

ہے۔ قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے جمع کئے، مسائل دریافت کیے اور ان سارے امور میں بطور خود اجتہاد کیا، پھر ایک گروہ کے پیشوا اور امور شرعیہ میں مستند قرار پاگئے۔ یہ لوگ بھی اپنے اپنے شیوخ کے نہج پر چلے اور سلف کے اقوال و فتاویٰ کے اشارات اور مقتضیات معلوم کرنے میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا۔ لوگوں کو فتوے دیے، احکام سنائے، روایتیں بیان کیں اور علم سکھائے۔

ان علماء کا طرز فکر و استدلال اس طبقہ کے علماء کا طرز فکر بالکل ایک ہے جس کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ:۔

(۱) مسند اور مرسل[1] دونوں ہی قسم کی احادیث قابل تمسک ہیں۔

(۲) صحابہ و تابعین کے اقوال سے شرعی استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کے اقوال کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں: یا تو وہ فی نفسہٖ رسول اللہ صلعم سے نقل کی ہوئی حدیثیں ہیں جن کو انھوں نے (بعض مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے) مختصر کر کے موقوف[2] بنا لیا۔ چنانچہ جب ابراہیم نخعی نے آنحضرت کی محاقلہ[3] اور مزابنہ[4] سے ممانعت والی روایت بیان کی تو ان سے کہا گیا کہ کیا آپ کو اس کے سوا رسول اللہ کی کوئی حدیث (مرفوع) یاد نہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ "یاد کیوں نہیں ہے مگر میں حدیث مرفوع بیان کرنے کے مقابلہ میں یوں کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ "عبد اللہ نے یہ فرمایا ہے" یا "علقمہ کا یہ قول ہے"۔ اسی طرح شعبی سے جب ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس کی سند کو براہ راست پیغمبر صلعم تک پہنچایا جاتا ہے تو انھوں نے جواب دیا "ایسا کرنا ٹھیک نہیں بلکہ ہم کو زیادہ مناسب (اور محتاط) طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سند روایت کو صحابہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو وہ آنحضرت کی طرف منسوب نہ ہو سکے بلکہ صحابہ ہی پر ختم ہو جائے"۔ یا یہ اقوال کتاب و سنت کے نصوص سے ان کے اپنے استنباط کیے ہوئے احکام ہیں۔ یا پھر وہ ان کی اپنی اجتہادی رائیں ہیں (لیکن اس استنباط اور اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ) یہ نفوس قدسیہ ان امور میں طرز عمل کی جو خوبی اور فکر و رائے کی جو درستگی رکھتے تھے اس میں بعد کے آنے والے حضرات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، نیز وہ ان سے باعتبار زمانہ مقدم اور باعتبار علم افضل بھی تھے۔ اس لیے ان کے اقوال پر عمل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس میں دو رائیں ہوتیں، بجز اس صورت کے جبکہ ان میں خود اختلاف رائے ہو جائے اور حدیث نبوی ان کے اقوال کے بالکل مخالف واقع ہو۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں احادیث باہم مختلف ہوتیں تو یہ حاملین علم دین اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں یہ نظر آتا کہ صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل قرار دیا ہے، یا نسخ و تاویل کی کسی تصریح کے بغیر ہی اس کے ترک کر دینے اور اس پر عمل نہ کرنے پر متفق الرائے ہو گئے ہیں ــــ کہ اس کا مطلب بھی دراصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا ماؤل ہی قرار دینا ہے ــــ تو ان تمام صورتوں میں یہ علماء اقوال صحابہ کا اتباع کرتے اور اس حدیث کو وہی حیثیت اور وزن دیتے جو صحابہ کے یہاں پاتے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کتے کے جھوٹے برتن کا حکم بیان کرنے والی حدیث[5] کے متعلق حضرت امام مالک کے منہ سے نکلی تھی کہ "یہ حدیث

---

[1] مسند وہ حدیث ہے جس کی سند بیان کی جائے اور مرسل وہ جس کی سند بیان کیے بغیر کوئی تابعی یا تبع تابعی یوں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یا ایسا کیا ہے۔

[2] موقوف، مرفوع کے بالمقابل حدیث کی ایک قسم کا نام ہے۔ مرفوع وہ روایت ہے جس میں تصریح ہو کہ حضور نے ایسا فرمایا ہے، اور موقوف وہ جس میں صحابی ایک بات کہے اور صراحت کے ساتھ اسے حضور کی طرف منسوب کرے۔ [3] محاقلہ کے معنی ہیں کہ خوشوں سمیت گندم کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض بیچا جائے یا کچی کھیتی بیچنا۔

[4] مزابنہ کے معنی ہیں درخت پر لگی ہوئی تر کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا۔ [5] حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھوؤ، اس کے بعد ایک بار مٹی سے مانجھ کر صاف کرو۔ (مترجم)

روایت تو ہوئی ہے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس پر فقہا کو عمل کرتے ہوئے نہیں پایا۔

(۴) اگر صحابہ اور تابعین کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا تو ہر عالم اس رائے اور مسلک کو اختیار کرتا جو اس کے اپنے شہر کے علما اور اس کے شیوخ کا مسلک ہوتا کیونکہ وہ ان کے اقوال کے سقم و صواب سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے مناسبت رکھنے والے اصولوں کا بہتر رازداں ہوتا، نیز اس لیے کہ اس کا دل اپنے اساتذہ کے فضل و کمال اور تبحر علمی سے زیادہ متاثر ہوتا چنانچہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ صحابہ عظام اور ان کے شاگردانِ جلیل مثلاً سعید ابن مسیب (جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے) اور عروہ، سالم، عطاء، عکرمہ اور عبیداللہ ابن عبداللہ وغیرہ کا مذہب اہل مدینہ کے لیے دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ قابل قبول و مستحق اتباع ٹھیرا، اس وجہ سے بھی کہ آنحضرتؐ نے مدینہ کے بڑے فضائل[۱] بیان فرمائے ہیں اور اس سبب سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہا اور علما کا مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک علماء مدینہ کی شاہراہ سے ہٹ کر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت شرعی مانتے تھے۔ اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے جس کا نام ہے "باب فی الاخذ بما اتفق علیہ الحرمان"۔ یعنی جس بات پر اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کے بالمقابل حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کا مذہب اور حضرت علی اور قاضی شریح اور شعبی کے فیصلے اور ابراہیم نخعی کے فتاویٰ اہل کوفہ کی نگاہ میں دوسرے اقوال و مذاہب کی بہ نسبت زیادہ مختار اور لائق اتباع قرار پائے۔ چنانچہ یہی بنائے ترجیح تھی جس کے اثر کے تحت علقمہ نے تشریک[۲] کے مسئلہ میں مسروق کو زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ الفاظ کہے تھے کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم و تفقہ رکھتا ہے"؟ مسروق نے جواب دیا کہ نہیں، ایسا تو نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور دوسرے باشندگان مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا ہے (اس لیے میرا خیال ہوا کہ یہ جائز ہے)۔ الغرض ہر عالم کے نزدیک اس کے اپنے ہی شیوخ اور علمائے شہر کے اختیار کردہ اقوال مرجح اور قابل اخذ و اتباع ہوتے تھے۔ اگر اہل شہر کسی امر پر متفق ہوتے تو یہ علما اس کو دانتوں سے پکڑ لیتے۔ چنانچہ امام مالک ایسے ہی مسائل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "جس سنت میں (اہل مدینہ کا) کوئی اختلاف نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک ایسی اور ایسی ہے" (یعنی بالکل ثابت اور واجب العمل ہے)۔ اور اگر اہل شہر کسی مسئلہ میں مختلف الرائے ہوتے تو ان مختلف رایوں میں سے یہ حضرات اس رائے کو اختیار کرتے جو زیادہ مضبوط اور راجح نظر آتی۔ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی رائے مضبوط اور راجح ہے اس بات سے ہوتا کہ اکثریت کس طرف ہے، یا یہ کہ کونسا قول مضبوط قیاس پر مبنی ہے، یا یہ کہ کونسا مذہب کتاب و سنت کی تخریجات سے اوفق ہے۔ جہاں امام مالک یوں فرماتے ہیں کہ "یہ بات ان تمام باتوں میں سب سے بہتر ہے جو اس مسئلہ کے متعلق میرے علم میں آئی ہیں" تو دراصل اسی طریق فکر و طرز عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر اگر یہ علما صحابہ اور تابعین کے مجموعۂ اقوال میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو انہی اقوال کو بنیاد قرار دے کر اس سے استنباط کرتے اور ان کے اشارات و مقتضیات کی پوری جستجو کر کے جواب مسئلہ کا سراغ لگاتے۔

---

[۱] آپ نے فرمایا تھا کہ جلد ہی لوگ طلب علم کی خاطر سواریاں دوڑائیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی صاحب علم و فضل نہ پائیں گے۔

[۲] تشریک کا مطلب یہ ہے کہ مالک زمین اپنی زمین بٹائی پر کاشت کرنے کے لیے دوسرے کو دیدے۔ (مترجم)

مذاہب اربعہ کا ظہور یہی وہ طبقہ ہے جس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ فقہ پر کتابیں مرتب کی جائیں۔ چنانچہ مدینہ میں امام مالک اور محمد ابن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب نے، مکہ میں ابن جریج اور ابن عُیینہ نے، کوفہ میں امام ثوری نے اور بصرہ میں ربیع ابن صبیح نے فقہ میں مستقل کتابیں لکھیں۔ ان تمام حضرات کا طریقۂ تدوین وہی تھا جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

امام مالک اور مذہب مالکی خلیفہ منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالک سے کہا کہ "میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کے متعدد نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھجوا دوں اور حکم دے دوں کہ سب لوگ بس انہی کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں"۔ امام مالک نے جواب دیا کہ "اے امیرالمومنین! ایسا نہ کر، کیونکہ لوگوں میں (سلف کے مختلف) اقوال پھیل چکے ہیں اور (مختلف اقسام کی) حدیثیں ان تک پہنچ چکی ہیں۔ ان مختلف اقوال و احادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو اس کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ پس لوگوں کو آزاد چھوڑ دے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دے جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے"۔

بعض لوگوں نے اس قصہ کو منصور کے بجائے ہارون الرشید کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی روایت اس طرح کی ہے کہ ہارون نے امام مالک سے بطور مشورہ پوچھا کہ "کیا آپ کی موطا خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ تمام اختلافات چھوڑ کر اسی کے مطابق عمل کریں"؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ "ایسا نہ کرو (یہ اختلاف صحابہؓ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے)۔ فروع میں صحابہ خود مختلف الرائے تھے اور وہ (اپنے مختلف مذاہب لیے ہوئے) اطراف ملک میں بکھر گئے اور ہر ایک کا طریقہ مختلف علاقوں میں اب چل پڑا ہے"۔ یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا "اے ابوعبداللہ! اللہ تم کو (حکمت و دین کی) اور زیادہ توفیق دے"۔ اس واقعہ کو امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔

امام مالک ان احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ اور بلحاظ اسناد وہ سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ نیز وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبداللہ ابن عمرؓ اور عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں شاگردوں[1] کے اقوال کے سب سے بڑے عالم اور جامع ہیں۔ اسی ہستی اور اسی جیسی دوسری مبارک ہستیوں کے ہاتھوں علم روایت و فتویٰ کی بنیاد پڑی۔ مسندِ علم و ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد امام موصوف نے روایت حدیث، افتاء اور افادۂ علمی کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کے باعث آنحضرت کی اس پیشینگوئی کے مصداق سمجھے گئے کہ "زمانہ قریب ہے کہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں دوڑ دھوپ کریں گے، سو اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم و فضل نہیں پائیں گے"۔ ابن عیینہ اور عبدالرزاق کا خیال ہے کہ یہ پیشنگوئی امام مالک پر صادق آتی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی اصابت رائے مسلم ہے۔ پھر امام مالک کے تلامذہ نے ان کی روایات اور مختارات کو اکٹھا کیا، ان کی تلخیص اور تنقیح کی، شرحیں بیان کیں، ان کے اصول و دلائل پر بحثیں کیں، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کی تخریج کی اور ان چیزوں کو لے کر یہ لوگ مختلف ممالک میں خصوصاً مغرب کی طرف

---

[1] ان شاگردوں کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) سعید ابن مسیب (۲) عروہ ابن زبیرؓ (۳) قاسم ابن محمد ابن ابوبکر صدیق (۴) ابوبکر ابن عبدالرحمٰن مخزومی (۵) خارجہ ابن زید ابن ثابت (۶) عبیداللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ مسعودی (۷) سلیمان ابن یسار ہلالی۔ (مترجم)

پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی مخلوق کو نفع پہنچایا۔ ہم نے مذہب مالکی کی جو اصلیت بیان کی ہے اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنی چاہتے ہو تو "موطا امام مالک" کو نظر غائر سے دیکھو۔ تم پر حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

امام ابو حنیفہ اور مسلک حنفی امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم خیال علمائے تابعین کے مسلک پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور شاید ہی کبھی اس سے اختلاف و انحراف کرتے ہوں۔ اس مذہب کی بنیادوں پر مسائل کی تخریج کرنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ تخریجات کے طریقوں میں وہ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور انھوں نے اپنی پوری توجہ جزئیات کی توضیح و استنباط میں لگا رکھی تھی۔ اگر تم ہماری اس بات کی تصدیق چاہتے ہو تو امام محمد کی کتاب الآثار، عبدالرزاق کی جامع اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی مصنف میں سے ابراہیم نخعی کے اقوال چن کر جمع کر لو، پھر امام ابو حنیفہ کے مذہب سے ان کا مقابلہ کرو تو تم دیکھو گے کہ سوائے چند مقامات کے کہیں بھی اُن کا قدم ابراہیم نخعی کے جادۂ فقہی سے ہٹ کر نہیں پڑتا۔ اور یہ چند مقامات بھی ایسے نہیں ہیں کہ امام مذکور نے ان میں کوئی اپنی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ ان میں بھی دیگر فقہائے کوفہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے آگے موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ابو یوسف ہیں جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تھے۔ ان کا یہی منصب تھا جس کے باعث حنفی مذہب ہر چہار طرف پھیل نکلا اور عراق، خراسان اور توران کے حدود میں حکومت کا آئین قرار پا گیا۔

دوسرے شاگرد جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے تمام تلامذہ میں ممتاز اور حصول علم میں سب سے زیادہ انہماک رکھنے والے تھے، امام محمد بن حسن ہیں۔ انھوں نے پہلے تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف سے فقہ حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالک سے موطا پڑھی۔ اس کے بعد بطور خود تفکر شروع کیا اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلہ کا موطا سے مقابلہ کر کے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ (اختلاف کی شکل میں) صحابہ اور تابعین کے مذاہب و اقوال کی جستجو کی، اگر کسی گروہ کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں وہ مذہب حنفی پر قائم رہے، لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہو تو ایسی حالت میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کر لیا جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ فائق اور مرجح نظر آیا۔

امام ابو حنیفہ کے ان دونوں تلامذہ نے بھی ابراہیم نخعی کے مذہب کی حتی الامکان اسی طرح پیروی کی جس طرح امام ابو حنیفہؒ نے کی تھی۔ صرف دو نقطہ ہائے اختلاف تھے جو استاد اور ان کے تلامذہ کے مابین واقع ہوتے تھے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ امام ابو حنیفہ نے ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا۔ اور کبھی یہ صورت ہوتی کہ ابراہیم نخعی وغیرہ فقہائے کوفہ کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال ہوتے تو ان اقوال میں سے کسی ایک قول کو منتخب و ترجیح دینے میں یہ دونوں، امام موصوف کی مخالفت کر جاتے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، امام محمد نے تصنیف و تدوین کی طرف توجہ کی اور ان تینوں فقہا کے اقوال اکٹھے مرتب کیے، جس سے

بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ پھر بعد کے علمائے حنفیہ امام محمد کی ان تصانیف کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ ان کو چھانٹا اور صاف کیا۔ ان کے مطالب کی وضاحت کر کے ان کو قریب الفہم بنایا۔ ان کی بنیاد پر مزید مسائل کا استنباط کیا اور ان کو دلائل سے مبرہن کیا۔ پھر یہ لوگ (ان تمام تصانیف کو لے کر) خراسان اور توران کی طرف جا نکلے اور ان تصانیف کے سارے مسائل امام ابوحنیفہ کا مذہب کہے جانے لگے۔ اس طرح امام ابویوسف اور امام محمد کے مذاہب بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ساتھ مل گئے اور ان سب کو ایک ہی مذہب شمار کیا گیا، حالانکہ یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابوحنیفہ سے ان کے اختلافات کی فہرست کافی طویل ہے، نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا اصل ان تینوں میں مشترک ہے (یعنی یہ تینوں ہی حضرت ابراہیم نخعی کے مذہب کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں۔) اور دوسرے یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں مذاہب کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

امام شافعی اور مسلک شافعی | ان دونوں مذاہب۔ مذہب مالکی اور مذہب حنفی ۔۔۔ کی شہرت و اشاعت اور ان کے اصول و فروع کی ترتیب کا آغاز تھا کہ اس بزم میں ایک تیسرے امام، امام شافعی تشریف لائے۔ آپ نے اگلے لوگوں کے طریق فکر و استنباط کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس میں ایسی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں جنھوں نے ان کو اس راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا۔ ان باتوں کا ذکر امام موصوف نے اپنی تصنیف "کتاب الام" کے ابتدائی اوراق میں (بڑی وضاحت سے) کیا ہے۔ ان کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے:۔

(۱) یہ لوگ (فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ) مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پا لیتی ہیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے (اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں۔ اس لیے امام شافعی نے فیصلہ کیا کہ مرسل روایتوں کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ ان شرطوں کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔

(۲) ان حضرات کے ہاں مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قواعد منضبط نہ تھے جس کے باعث ان کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعی نے پہلے یہ اصول و قواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔ اس امر کی مثال (کہ امام شافعی کے خیال کے مطابق پچھلے فقہا کے اجتہادات اصول تطبیق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے تھے) اس واقعہ میں موجود ہے کہ ایک دن امام شافعی امام محمد کے ہاں آئے۔ امام محمد اپنی تقریر میں فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ یہ لوگ فصل مقدمات کے لیے دو گواہوں کی شہادت ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف ایک ہی گواہ کی گواہی اور مدعی کی قسم پر بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ ہے[1]

[1] اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قرآن کے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی ترمیم یا تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہی شہادت کا مسئلہ ہے جس کی بابت قرآن میں عام حکم ہے کہ فصل مقدمات کے لیے دو شاہد چاہییں۔ مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شاہد مہیا نہ ہو سکیں تو مدعی کی قسم اور ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہے۔ گویا حلف دوسرے گواہ کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ (مترجم)

امام شافعی نے یہ تقریر سن کر کہا "کیا آپ کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز نہیں؟" انھوں نے فرمایا کہ "ہاں"۔ امام شافعی نے کہا "تو پھر آپ حدیث لا وصیۃ لوارث کو لے کر، جو ایک خبرِ واحد ہے، یہ کیوں کہتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، حالانکہ کتاب اللہ کہتی ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو وہ اگر اس نے مال چھوڑا ہو۔ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر دے) کیا یہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ نہیں ہے؟" اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کے اور بھی چند اعتراضات امام محمد پر کیے، جن کے جواب میں امام محمد کو انجام کار خاموش ہونا پڑا۔

(۳) وہ علمائے تابعین، جن کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد تھی، بعض صحیح حدیثوں سے لاعلم تھے اس لیے انھوں نے مسائل پیش آمدہ میں یا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا یا عام خیالات کو لے لیا یا اگلے صحابہ کے طرزِ عمل کو اختیار کر لیا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیدیا پھر کبھی ایسا ہوا کہ آگے چل کر تیسرے طبقہ میں وہ حدیثیں منظرِ عام پر آئیں لیکن پھر بھی ان فقہا نے ان کو چھوڑے ہی رکھا اور ان پر صرف اس خیال سے عمل نہیں کیا کہ یہ حدیثیں ہمارے علمائے شہر کے عمل اور مذہب کے جس سے ہم کوئی اختلاف نہیں رکھتے مخالف ہیں، اور یہ مخالفت بتاتی ہے کہ ان حدیثوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور علت ضرور موجود ہے جس نے ان کو مرتبہ قبول اور پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ یہ احادیث تیسرے طبقہ میں بھی شہرت عام حاصل نہ کر سکیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں میں مشہور ہوئیں جبکہ علمائے حدیث نے اسناد و طرقِ حدیث کو جمع کرنے میں پوری کاوش دکھلائی اور اس کے لیے زمین کا ایک ایک گوشہ چھان کر اربابِ علم کا کھوج لگایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ایک یا دو سے اوپر نہیں، پھر ان صحابہ سے یہ حدیثیں سن کر دوسروں سے بیان کرنے والے بھی دو ہی ایک آدمی ہیں، اور اسی طرح آگے تک راویوں کی یہ قلت تعداد چلی گئی جس کے سبب سے یہ احادیث عام اہلِ فقہ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئیں اور ان حفاظِ حدیث کے زمانہ میں پردۂ خفا سے باہر نکلیں جنھوں نے حدیث کو ان کے طرق و اسانید کے ساتھ جمع کیا۔ پھر ایک دوسری شکل یہ بھی تھی کہ کتنی ہی حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک خاص خطۂ ملک کے لوگ ہیں، مثلاً اہلِ بصرہ نے ایک حدیث روایت کی اور باقی تمام دیگر مقامات کے لوگ ان سے بالکل بے خبر رہ گئے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ علمائے صحابہ و تابعین کا برابر یہ دستور رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو پہلے وہ رسول اللہ کی حدیث تلاش کرتے، اگر کوئی حدیث نہ ملتی تب جا کر کسی اور طریقۂ استدلال سے کام لیتے۔ مگر اس کے بعد بھی قبولِ حدیث کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے تھے بلکہ بعد میں جب بھی کوئی حدیث ان کو مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو ترک کر دیتے اور حدیث کو اختیار کر لیتے۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو ان علما کا کسی حدیث سے تمسک نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حدیث ہی کمزور ہے۔ الا آنکہ انھوں نے صراحت کے ساتھ اس کی تضعیف اور تنقیص کر دی ہو۔ حدیث "قلتین"[1] اس کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے جو بہت سی سندوں سے مروی ہے، جن میں سے اکثر کا سرِ رشتہ اس سلسلہ روایت سے بندھتا ہے کہ یہ حدیث ولید بن کثیر نے محمد ابن جعفر ابن زبیر سے یا محمد ابن

[1] اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا۔ یعنی جب پانی دو "قلہ" ہو تو وہ کسی نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔
"قلہ" اس بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پانی آ سکے، یا بقول بعض دو مشک پانی۔ (مترجم)

عباد ابن جعفر سے روایت کی اور انھوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے نقل کی اور عبید اللہ نے ابن عمرؓ سے بیان کی۔ بعد میں چل کر اس سلسلۂ اسناد سے شاخ در شاخ بہت سے سلسلہ ہائے سند پیدا ہوگئے۔ یہ دونوں راوی (محمد ابن جعفر اور محمد ابن عباد) اگرچہ پوری طرح قابل اعتبار ہیں مگر یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو فتویٰ دینے کے منصب پر سرفراز اور مرجع عوام تھے اس وجہ سے یہ حدیث نہ تو سعید ابن مسیب کے زمانہ میں مشہور ہو سکی نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں، اور نہ تو مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے۔ مگر امام شافعیؒ کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے اس کو قابل عمل ٹھیرایا۔

ایک اور مثال "خیار مجلس" والی حدیث کی ہے[1] جو ایک صحیح حدیث ہے اور بہت سے طریقوں سے روایت ہوئی ہے اور صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ لیکن "فقہائے سبعہ" اور ان کے ہم عصر دوسرے علما تک نہ پہنچ سکی، اس لیے انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا اور یہ چیز امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک حدیث میں قدح کی علت بن گئی، لیکن امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابہ کے اقوال امام شافعی کے زمانہ میں کثرت سے اکٹھا ہوئے جن میں کافی اختلاف اور انتشار تھا۔ آپ نے ان پر تنقید و تحقیق کی نگاہ ڈالی تو ان کا ایک بڑا حصہ احادیث صحیحہ کا مخالف نظر آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کو یہ حدیثیں پہنچی ہی نہ تھیں۔ پھر علمائے سلف کو دیکھا کہ اس معاملہ میں وہ برابر اقوال صحابہ کو چھوڑ کر احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ان اقوال کو تو قابل حجت و عمل مانا جن پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ مگر باقی کو لائق تمسک تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "صحابہ بھی انسان تھے اور ہم بھی (انہی کی طرح کے) انسان ہیں"۔[2]

(۵) امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا کا ایک گروہ "رائے" کو، جس کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا ہے، قیاس کے ساتھ، جس کو شریعت میں اعتبار کا مقام حاصل ہے، گڈمڈ کر رہا ہے اور ان میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ یہ لوگ اس "رائے" کو کبھی استحسان بھی کہتے ہیں — "رائے" سے میری مراد یہ ہے کہ کسی نقصان یا کسی مصلحت کے مظنہ کو کسی حکم کی علت ٹھیرا دیا جائے، اور قیاس یہ ہے کہ ایک حکم منصوص کی علت دریافت کی جائے اور اس علت کی بنا پر دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے۔ امام شافعیؒ نے فقہا کے اس طرز عمل کا پوری قوت سے ابطال کیا اور کہا کہ "جو استحسان یعنی رائے سے کام لیتا ہے وہ دراصل شارع بننا چاہتا ہے"۔ اس قول کو عضد نے "مختصر الاصول" کی شرح میں درج کیا ہے۔ اس کی مثال "رشد یتیم" کا مسئلہ ہے۔ یتیم کا معاملہ فہم ہو جانا ایک مخفی امر ہے (جس کے لیے کوئی متعین تاریخ نہیں بتائی جا سکتی) لیکن فقہا نے یہ دیکھ کر بالعموم پچیس سال کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آ جاتی ہے، اس "مظنۂ رشد" (یعنی پچیس سالہ عمر) کو اس کا قائم مقام قرار دے کر یہ اصول بنا دیا کہ "جب یتیم کی عمر پچیس سال کی ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے"۔ اور کہا کہ یہ "استحسان ہے"۔ اس کے بالمقابل اس مسئلہ میں قیاس یہ ہے کہ مال

---

[1] وہ حدیث یہ ہے کہ "جب تک خریدار اور فروخت کنندہ باہم الگ نہ ہو جائیں، اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو معاملۂ بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

[2] یعنی ہماری ہی طرح وہ بھی فہم و نظر کی فطری لغزشوں سے مامون نہ تھے کہ ان کے اقوال کو ایک نبی معصوم کے کلام کی طرح آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ نصوص کتاب و سنت سے جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں، ہم ان کے استنباط کے ہم پابند کیوں ہوں۔ (مترجم)

اس کو سپرد کیا جائے (تا وقتیکہ وہ واقعۃً معاملہ فہم اور صاحب عقل و رشد نہ ہو جائے)۔

مختصر یہ کہ جب امام شافعی نے اپنے پیشروؤں میں اس قسم کی باتیں دیکھیں تو (ان سے نامطمئن ہو کر) انھوں نے علم فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور بطور خود اس کے اصول مرتب کیے اور ان اصولوں پر جزئیات کا استنباط کیا۔ اس فن پر مستقل اور بہترین کتابیں لکھیں جو لوگوں کی فیضیابی کا ذریعہ بنیں۔ فقہائے وقت آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور آپ کی تصنیفات کو لے کر ان کا اختصار کیا، ان کی شرحیں لکھیں، ان سے دلیلیں اخذ کیں اور ان کو سامنے رکھ کر مزید مسائل مستنبط کیے۔ پھر (ان سب چیزوں کو لے کر) مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ اس طرح یہ فقہ کا ایک الگ اسکول قرار پایا جس کی نسبت امام شافعی کی طرف تھی۔

(باقی)

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	حصہ اول	[illegible]	مجلد	[illegible]
" " "	" دوم	[illegible]	"	[illegible]
تفہیمات	....	[illegible]	"	[illegible]
خطبات	...... قسم اول	[illegible]	"	[illegible]
"	...... " دوم	[illegible]		
رسالہ دینیات	...... " اول	[illegible]	"	[illegible]
" "	...... " دوم	[illegible]		
مسئلہ جبر و قدر	....	[illegible]		
تجدید و احیائے دین	....	[illegible]	"	[illegible]
پردہ	....	[illegible]	"	[illegible]
حقیقت توحید	....	[illegible]	"	[illegible]
روداد جماعت اسلامی	...... " دوم	۹ر		
" " "	...... " سوم	[illegible]	"	[illegible]
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	ہر سہ حصہ		"	[illegible]

نوٹ:۔ جن کتابوں کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔ وہ ختم ہو چکی ہیں۔
مجلد کتب پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔

"مینیجر"

حضرت موسیٰ نیشنلسٹ لیڈر تھے
یا
نبی اور رسول؟

ہمارے ایک رفیق نے کسی عالم دین کی ایک تحریر یا تقریر کے کچھ اقتباسات ہم کو بھیجے ہیں اور ان پر چند سوالات کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اور سوالات یہاں نقل کر کے ہم ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباسات یہ ہیں:-

"بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گذر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کر اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل گیا ہے) اس کے "حد سے نکل جانے" کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔"

"ادھر جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے ہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے) تو آیت سے صراحتاً یہ واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لیے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری، اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھیرتی؟"

"ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لیے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے، نہ اقتصادیات کا، نہ اپنے اور اپنے وطن کے تعلقات کا، نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا، بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔"

"یہی ہے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا، نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ "توجہ فرمائی" جس سے مالی حالت درست ہوتی اور نہ اور ہی امور کی طرف "زیادہ" التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کو تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ تاکہ یہ "آزادانہ" زندگی بسر کر سکیں اور اپنی "مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود" کرنے پر قادر ہو جائیں۔"

"پس آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند ہی سے متعلق ہے۔۔۔۔۔۔پس مسلمانوں کے لیے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے انھیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات پیش کر کے ہمارے بھائی نے ہم سے مندرجہ ذیل سوالات کیے ہیں:-

"کیا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی اولین غرض بنی اسرائیل کو آزاد کرانا تھا؟ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض یہ نہیں ہے؟ اگر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض آزادیٔ بنی اسرائیل تھی جیسا کہ مولانا نے فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) سے استدلال کیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم بات آزادی کی جدوجہد ثابت ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے رفع جہالت کا مسئلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس سے مختلف راستہ اختیار کیا؟ آپ بھی آزادی کی جدوجہد میں دوسرے علمائے کرام کی طرح کیوں نہیں لگ جاتے؟ آخر آپ ایک بنیادی مسئلہ کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری، ضمنی اور بالکل ہی غیر بنیادی مسئلہ (رفع جہالت مسلمین) میں اپنی اور اپنے رفقاء کی قوت و قابلیت کیوں صرف فرماتے ہیں؟ اور اگر ان پیدا شدہ سوالات کی بنیاد آپ کے نزدیک غلط ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس معروضہ پر پوری تفصیل کے ساتھ کلام فرمائیے۔ ایک طرف اس عالم دین کی شخصیت ہے جو علم و تقویٰ میں کل ہند شہرت رکھتی ہے دوسری طرف اس کے یہ ارشادات ہیں جن کے نتائج سے دل لرزتا ہے۔ ہمیں بتائیے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام فی الواقع کوئی "نیشنلسٹ لیڈر" تھے یا "نبی اور رسول" تھے؟

ہمارے یہی بھائی ایک دوسرے گرامی نامہ میں ایک اور سوال دریافت فرماتے ہیں جو اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس سے اوپر کی غلط فہمیوں کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے اس وجہ سے ہم اسے بھی یہیں درج کیے دیتے ہیں تاکہ اسی ضمن میں اس کا بھی جواب ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"۱۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل ان ہی حالات میں گرفتار تھے جن میں آج ہندی مسلمان گرفتار ہیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کی اخلاقی تربیت پر زیادہ زور نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو انھوں نے اپنی قوم کے صالحین کو چھانٹ کر الگ ایک جتھا نہیں بنایا یہاں تک کہ جب وہ نکلے ہیں تو کوئی بھی اسرائیلی پیچھے نہیں رہا۔

"۲۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر میں باب کے خاتمہ کے قریب ایک حدیث آئی ہے کہ جب آپ بدر کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک بہادر جری آدمی ملا اور اس نے کہا "جئت لا تبعك واصيب معك" لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے "ایمان باللہ والرسول" کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسلم نہیں ہے اس پر آپ نے فرمایا "ارجع فلن استعين بمشرك"۔ اسی طرح کئی بار سوال و جواب ہوا بالآخر اس نے ایمان باللہ والرسول کا اقرار کیا تو اسے "مومن" کی حیثیت سے "جہاد" میں شرکت کی اجازت دی اور وہ مجاہدین کے ساتھ چل پڑا۔

نمبر اول سے معلوم ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کچھ بہت زیادہ پکے اور کچے لوگوں کو چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ وہ جس درجہ پر بھی ایمان کے مدعی ہوں انھیں لے کر آزادی کے حصول کی کوشش شروع کر دی جائے پھر آزاد ہونے کے بعد تزکیہ وغیرہ کا کام شروع کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

نمبر ۲ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے مسلمان تو خیر پرانے ہیں جو آج ہی ایمان لائے ہوں اور تطہیر و تزکیہ ان کا بالکل نہ ہوا ہو

انھیں بھی بغیر کسی تیاری کے جہاد میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر جماعت اسلامی اپنے اس ابتدائی مرحلہ پر کن وجوہ سے کاٹ چھانٹ کرتی ہے؟ ہندوستان کے مسلمان بنی اسرائیل سے، اور اس نو مسلم سے زیادہ بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

تین غلط فہمیاں

یہ سارا استدلال درحقیقت تین غلط فہمیوں پر مبنی ہے:-

۱- پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے صرف یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے۔ ان بزرگوں کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یا تو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول سرے سے بھیجے ہی نہیں گئے تھے، یا بھیجے گئے تھے تو قاعدہ کے تمام رسولوں کے طریقہ کے خلاف، فرعون اور اس کی قوم کے لیے ان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی کہ ان کو ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت دیں، ان پر اللہ کی حجت تمام کریں، ان کو خدا سے ڈرائیں اور تذکیر و تبلیغ کا وہ فرض انجام دیں جو ہر نبی اور رسول ان لوگوں کے اندر انجام دیتا ہے جن کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے۔ یہ ساری ذمہ داریاں ان کے اوپر صرف بنی اسرائیل کے لیے تھیں۔ فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت و ضلالت سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ فرعون سے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی قوم کو اس کی غلامی سے چھڑالیں۔ بس اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا تھا چنانچہ جاتے ہی انھوں نے یہ مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کردیا اور اسی طرح پیش کردیا جس طرح کانگریس نے "ہندوستان کو خالی کردو" (Quit India) کا ریزولیوشن پاس کردیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کانگریس نے یہ تجویز نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد کے بعد پاس کرنے کی جرأت کی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ خدا کی طرف سے صرف بنی اسرائیل کو آزادی ہی دلانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے بے خوف و خطر انھوں نے اپنا مطالبہ، پہلی ہی ملاقات میں، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے رکھدیا۔ اور ان کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ بنی اسرائیل کی آزادی کی مہم پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں انھوں نے متعدد معجزات دکھائے لیکن یہ لوگ، ان معجزات کے بعد بھی، بنی اسرائیل کو غلام بنانے ہی پر اڑے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوگئے اور فرعون اور اس کی ساری فوج ان کا تعاقب کرتے ہوئے بحر قلزم میں غرق ہوگئی۔

۲- دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دوران کی مصر کی زندگی کا۔ دوسرا دوران کے مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی کا۔ اور ان دونوں دوروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام بنی اسرائیل کے اندر، ان لوگوں کے نزدیک، دو بالکل مختلف نوعیتیں رکھتا ہے۔ پہلے دور میں ان کے نزدیک اصلی کام بنی اسرائیل کی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔ اس دور میں انھوں نے نہ ان کے عقائد و ایمانیات کا سوال چھیڑا اور نہ ان کی تربیت و تزکیہ کی طرف کچھ ایسی توجہ کی۔ صرف نسبی عصبیت کے نعرہ پر، جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر کرتا ہے انھوں نے تمام بنی اسرائیل کے اندر آزادی کی ایک لگن پیدا کردی اور ان کو اپنی قیادت پر جمع کرلیا۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص خدا کو مانتا ہے یا نہیں، آخرت پر اس کا ایمان ہے یا نہیں، ان کی رسالت پر اس کو عقیدہ ہے یا نہیں، ہر اسرائیلی ان کی فوج کا سپاہی اور ان کی جماعت کا ایک رکن تھا اور ان سب کو بلا فرق و تمیز وہ مصر سے لے کر نکلے۔ ان کے مومن و منافق اور کافر و فاسق میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جب فرعون کی غلامی سے باہر نکل آئے، تب انھوں نے ان کی تربیت و تعلیم اور اصلاح و تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو خدا اور اس کے قانون سے آشنا کیا۔ اس طرح

ان حضرات کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام، ان کی زندگی کے پہلے دور میں ایک نیشنلسٹ لیڈر کے کام سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اور مصر میں انھوں نے فرعون سے جو لڑائی لڑی وہ شرک و توحید اور کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی بلکہ قبطیت اور اسرائیلیت کی جنگ تھی۔ ایک قوم پرست لیڈر کو جس طرح اپنی قوم کی آزادی عزیز ہوتی ہے اسی طرح ان کو بھی اپنی قوم کی آزادی عزیز تھی جس طرح ہر شخص جو نسل و خون اور وطنیت و قومیت میں اس لیڈر کا شریک ہوتا ہے، ان کے مفاد کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہر اسرائیلی کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اور جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر اشتراک او رہم جنسی کے ان بنیادی اصولوں کے سوا جن پر اس کی قوم کی قومیت قائم ہوتی ہے، اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قبطیت اور اسرائیلیت کے اس معرکہ میں، اسرائیلیت کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی۔

۳۔ تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک ساری برائیوں کی جڑ غلامی اور ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ آزادی ہے۔ غلامی سے، ان حضرات کے نزدیک، مراد یہ ہے کہ کوئی قوم جو نسل و خون، تہذیب و معاشرت اور جغرافیائی حدود کے اعتبار سے ایک علیحدہ قوم گنی جاتی ہو وہ کسی ایسی قوم کی محکوم ہو جائے جو ان اعتبارات سے ایک علیحدہ حیثیت رکھتی ہو۔ اور آزادی کا مفہوم، ان کے نزدیک، یہ ہے کہ اس طرح کے اجنبی اقتدار سے محکوم قوم آزاد ہو کر اپنی تعمیر باختیار خود کر سکے۔ یہ آزادی اور اپنی تعمیر باختیار خود کر سکنے کا حق ان کے نزدیک تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے۔ جب تک کسی قوم کو یہ خود مختاری نہ حاصل ہو اس وقت تک وہ نیکی کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتی۔ اس وجہ سے، ان کے نزدیک، یہ ضروری ہوا کہ اگر کوئی قوم غلام ہو تو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس کو آزاد کیا جائے اور جب تک اس کو آزادی نہ حاصل ہو جائے اس وقت تک اس کی اصلاح و تربیت کے سارے کام ملتوی رکھے جائیں۔ ان حضرات کے نزدیک چونکہ یہ آزادی و خود مختاری تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لیے انبیاء مبعوث فرماتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ کسی غلام قوم کے لیڈروں کا سب سے بڑا، سب سے مقدس اور سب سے مقدم فرض اپنی قوم کو آزاد کرانا ہے۔

غلط فہمیوں کے تین سبب

ان غلط فہمیوں پر تنقید کرنے سے پہلے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان میں مبتلا ہونے والے حضرات معمولی لوگ نہیں بلکہ عالی مقام بزرگان دین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے اسباب کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں ان کے پیدا ہونے کے بھی تین سبب ہیں۔

(الف) پہلا سبب یہ ہے کہ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری جد و جہد جو انھوں نے مصر میں کی ہے، اصول و عقائد کی جنگ کے بجائے ایک قومی و نسلی نزاع کے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ جو شخص بھی تنقید کی گہری نظر کے بغیر اس کو پڑھے گا وہ اس کو ایک پیغمبر کی دعوتِ ایمان و اسلام سے زیادہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی تحریک آزادی سے زیادہ مشابہ پائے گا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری توجہ کا مرکزی نقطہ معلوم ہوتا ہے کہ "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو"۔ ساری داستان میں یہ بات کہیں نہیں نمایاں ہوتی کہ حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ، روزِ آخرت اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی پر دل سوزی کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہوں اور فرعون اور اس کی قوم سے کسی اصول ر

مسالک پر جنگ کر رہے ہوں جس پر ایمان لانے کے بعد اس نزاع کا خاتمہ ہو سکے۔ بلکہ ان کا اول و آخر مطالبہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہمیں جانے دو"۔ اس سلسلہ میں اگر خدا کا ذکر آتا بھی ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہی اس بات کا حقدار ہے کہ سب اسی کی غلامی اور بندگی کریں اور اسی کے قانون کو مانیں بلکہ فرعون اور اس کی قوم کے ایک حریف دیوتا کی حیثیت سے آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تو میرے لوگوں کو جانے دے"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا ذکر اگر آتا ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ خدا کے بندوں کا سا معاملہ کیا جائے بلکہ اس طرح آتا ہے کہ "اسرائیل خدا کا پہلوٹھا ہے اور ساری دنیا کی قومیں اس کے پاؤں کے نیچے کی چوکی بنیں گی"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح نظر نہیں آتے جس طرح ایک پیغمبر اپنی قوم میں شب و روز خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ اس کی دعوت پر ایمان لاتے ہیں ان کی زندگیوں کو سنوارنے کی فکر میں اپنی جان گھلاتا ہے اور جو لوگ اس سے بدکے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ڈھونڈھنے اور مانوس کرنے میں لگا رہتا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری جد و جہد بنی اسرائیل کو بحیثیت بنی اسرائیل منظم کرنے کے لیے ہے۔ اور اس تنظیم میں کافر و مومن، مخلص و منافق اور کھرے اور کھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ صرف اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا سوال ہے۔

توریت میں خدا کے ایک پیغمبر اور اس کے کارناموں کی تاریخ کا ایک بالکل قومی جہاد آزادی کے رنگ میں رنگ جانا کچھ تعجب انگیز نہیں ہے۔ جو بنی اسرائیل خدا کے بندے اور اس کی مخلوق (بشر ممن خلق) ہونے کی جگہ اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے محبوب اور اس کے لاڈلے ہیں، جو یہود ایمان باللہ اور اطاعت رسول کی جگہ اسرائیلیت کو نجات کی گارنٹی یقین کرنے لگے تھے۔ جو لوگ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر اور خدا کی گرفت سے بالکل محفوظ سمجھتے تھے، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ساری تاریخ کو ایمان و عقیدہ کی روشنی میں پیش کرنے کے بجائے نسلی اور قومی استحقاق کی روشنی میں پیش کریں۔ اس کے بغیر نہ وہ اپنے غرور کو تسلی دے سکتے تھے اور نہ اپنے ان تصورات (امانی) کے لیے کوئی وجہ جواز پیش کر سکتے تھے جن میں مبتلا ہو کر انھوں نے خدا کی ساری شریعت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پچھلی تاریخ کو قومی مفاخر کی ایک داستان کی شکل میں مرتب کر کے اپنے ماضی اور حال میں ایک ربط پیدا کر لیا۔ اگرچہ یہ مصنوعی ربط پیدا کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جگہ جگہ ویسا خلا چھوڑ گئے کہ قرآن نے ان کی تاریخ ہی کو ان کے باطل دعاوی اور ان کی لایعنی آرزوؤں کے خلاف سب سے بڑے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا تاہم ان کو اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ ہمارے "کل ہند شہرت" رکھنے والے علماء، جن کے تقویٰ و تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، قرآن کی تنبیہات کے باوجود ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

(ب) غلط فہمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اگرچہ بنی اسرائیل کی تاریخ صحیح نقطۂ نظر سے پیش کر دی ہے، جس سے یہود کی ساری غلطیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں لیکن قرآن میں اسی سلسلہ کی دو مشکلیں ایسی ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے حل نہیں کر سکتا۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون و بنی اسرائیل کی پوری سرگذشت کسی ایک جگہ نہیں بیان ہوئی ہے۔ مختلف سورتوں میں اس سرگذشت کے مختلف ٹکڑے، سورہ کے موضوع و مضمون کے اعتبار سے آئے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس پوری سرگذشت اور اس کے مختلف ادوار کو متعین کر کے ایک فریم میں لانا چاہے تو اس کو ذرا محنت کرنی پڑے گی

جس کو قرآن کا کوئی محنتی طالب علم ہی کرسکتا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ دوسرے انبیاء اور ان کی سرگذشتوں میں سے قرآن نے اولاً اتنا ہی حصہ بیان کیا ہے جتنا موقع کلام اور حکمت بیان کے پہلو سے ضروری تھا، ثانیاً اس کو بھی ایسے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے صبر اور ذہانت دونوں درکار ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ جلد باز ہیں اور قرآن کی پوری بات سمجھنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے ان کے مدعا کے موافق کوئی بات ان کے ہاتھ لگ جائے وہ نہایت آسانی سے، غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال ان حضرات کو بھی پیش آئی ہے جو "ارسل معنا بنی اسرائیل" کے ایک ٹکڑے کو پڑھکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک "نیشنلسٹ لیڈر" بنا بیٹھے۔ اور یہ سمجھنے لگ گئے "کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جد و جہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔"

(ج) غلط فہمی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی اور وطنی آزادی کی یہ تحریک جس کی قیادت آج کانگریس کر رہی ہے اور جس کی نہایت بھونڈی نقل مسلم لیگ نے اڑائی ہے، قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کر کے مسلمانوں نے نہیں شروع کی تھی۔ بلکہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں جس آزادی کا غلغلہ یورپ کے ملکوں میں بلند ہوا تھا بعینہٖ وہی چیز جدید تعلیم اور جدید مطالعہ تاریخ کے اثر سے ہمارے ملک کے غیر مسلموں میں پیدا ہوئی اور چونکہ اس طرح کی آزادی کے مقدس ترین فرض انسانی ہونے پر کافی لٹریچر تیار ہو چکا تھا اس وجہ سے نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی یہ چیز پھیلی اور بعینہٖ انہی تصورات و مطالبات کے ساتھ پھیلی جن تصورات و مطالبات کے ساتھ اس کے مغربی موجدوں نے اس کو وضع کیا تھا۔ شروع شروع میں مسلمانوں کے اندر سے کچھ منچلے اور حوصلہ مند لوگ اس کی طرف بڑھے۔ بعد میں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے کہ علماء کا گروہ بھی آزادیٔ وطن کی اس جد و جہد میں شریک ہو گیا اور جو حالات ان حضرات کو اس چیز کی طرف لائے وہ ایسے ہنگامہ خیز تھے کہ ان کے اندر نہ کسی کو اس بات پر غور کرنے کی مہلت ہی تھی کہ آزادی کا یہ مغربی تصور اور حصول آزادی کا یہ مغربی طریق کار اسلام سے کچھ مناسبت بھی رکھتا ہے یا نہیں اور نہ ان میں سے کسی بزرگ کے پاس وہ ضروری معلومات ہی تھیں جن کی روشنی میں وہ اس آزادی کا تجزیہ کر کے سمجھ سکتے کہ اس کے فلسفہ اور اس کے عمل میں فساد کے کتنے اجزاء ہیں اور صلاح کے کتنے ذرات ہیں۔ بس یہ نعرہ کہ "آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔" اور "ہندوستان کی آزادی ہی پر تمام عالم اسلامی کی آزادی منحصر ہے" ان حضرات کو اس میدان میں کھینچ لایا۔ بعد میں جب اس آزادی کا فلسفہ اور اس کے حصول کا طریق کار آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے آیا اور ہر مرحلہ میں انھیں یہ بات محسوس ہونے لگی کہ آزادی کا یہ تصور اور اس کے مطالبات اس تصور آزادی سے بالکل مختلف ہیں جو اسلام نے پیش کیا ہے اور قدم قدم پر وہ اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹا ہوا پانے لگے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی مخصوص قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ دنیا جہان کی آزادی کے لیے بتایا تھا تو انھیں اس بات کی فکر ہوئی کہ اپنے طرز عمل کو جائز ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کچھ دلیلیں فراہم کریں۔ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ وہ استدلال ہے جس سے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو ایک نیشنلسٹ لیڈر کے درجہ تک گرا دیا گیا ہے اور جس کو پڑھکر انسان کے کبر نفس پر حیرت ہوتی ہے کہ جب خدا کی کتاب اس کی خواہشوں کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ کس طرح توڑ مروڑ کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ ساری غلطی درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ان حضرات نے آزادی کی اس جد و جہد میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول

کی رہنمائی کے بغیر بالکل دوسرے محرکات کے ماتحت ڈال دیا اور اب کہ ایک غلط راہ کی بہت سی منزلیں طے کر چکنے کے بعد انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بالکل ایک غلط راہ پر پڑ لیے ہیں تو بجائے اس کے کہ الٹے پاؤں واپس لوٹیں اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح قرآن وحدیث سے ان کی یہ غلط روی ہدایت ثابت ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ یہ تو نکلنے سے رہا کہ غلط فہمیاں دور ہوں۔ اس کا نتیجہ تو بس یہی ہو سکتا ہے کہ جتنا ہی یہ حضرات اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے زور لگائیں گے اتنا ہی حق سے یہ اور دور ہٹتے جائیں گے۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ ہمت ہوتی کہ حق کی خاطر اپنی قیادت کے پندار کو مجروح کر سکتے تو ہمیں یقین ہے کہ اس غلط رنگ آمیزی کے باوجود، جو علمائے یہود نے اپنی تاریخ پیش کرنے میں کی ہے، اور اس ایجاز کے باوجود جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، بالکل پہلی نظر میں ان کے سامنے اصل حقیقت بالکل روشن ہو کر آجاتی۔

ایک نبی اور ایک نیشنلسٹ لیڈر کے بنیادی اختلافات

شاید ان حضرات نے کبھی سکون کے ساتھ اس مسئلہ پر غور نہیں فرمایا کہ ایک نبی کی دعوت اور ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک نبی کے نزدیک تمام خرابیوں کی جڑ انسان کی خود مختاری اور آزادی ہے اور تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور تنہا اسی کی اطاعت ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قوم پرست لیڈر ساری خرابیوں کی جڑ غلامی کو قرار دیتا ہے اور ساری ترقیوں کا منبع اپنی تقدیر با ختیار خود کرنے کے حق کو سمجھتا ہے۔ ایک نبی کی قوم ایمان و اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے سے بنتی ہے اور ایک قومی لیڈر کی قوم نسل و نسب اور وطنیت کے مسالہ سے تعمیر ہوتی ہے۔ ایک نبی کی ساری لڑائی اصول و عقائد سے ہوتی ہے۔ جو عقائد اس کے عقائد کے خلاف ہوتے ہیں ان سے وہ جنگ کرتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر پائے جاتے ہوں یا کسی دوسری قوم کے اندر، اور جو لوگ اس کے اصولوں کو مان لیتے ہیں وہ ان سے اپنی جماعت بنا لیتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر سے آئے ہوں یا اس کے باہر سے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قومی لیڈر کا سارا جھگڑا اس قوم سے ہوتا ہے جو نسل و نسب یا وطنیت اور رنگ میں اس سے مختلف ہے اور چونکہ یہ اختلاف بہر شکل باقی رہتا ہے اس وجہ سے اس کا اختلاف بھی بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک نبی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے وہ نظام پیش کرتا ہے جو تمام بنی آدم کے لیے یکساں مفید ہو اور ایک قومی لیڈر زندگی کے سارے نقشے اپنی قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر بناتا ہے۔ یہ بنیادی اختلافات اتنے اہم ہیں کہ اگر مذہب کی زبان میں ان کو تعبیر کیا جائے تو ایک کفر ہے، دوسرا ایمان، ایک توحید ہے دوسرا شرک۔ اس وجہ سے اس کا امکان بالکل نہیں ہے کہ ایک شخص نبی اور رسول بھی ہو اور قومی لیڈر بھی، یا ایک نبی اپنی زندگی کے کسی دور میں تو ایک قومی لیڈر کے اصولوں پر کام کرے اور دوسرے دور میں ایک نبی کے اصولوں پر۔ کیونکہ ایسا فرض کرنا درحقیقت اس بات کو فرض کرنا ہے کہ العیاذ باللہ ایک نبی اپنی ایک ہی زندگی کے اندر کفر و اسلام دونوں کے اصول جمع کر لے یا اپنی زندگی کے ایک دور میں تو وہ شرک کا داعی ہو اور دوسرے دور میں توحید کا۔ یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی صاحب فہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی مانے اور پھر اس کی طرف ایک قومی لیڈر کی خصوصیات بھی منسوب کر دے۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ بہت سے علمائے دین اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف نبی اور رسول تھے۔ اپنی بعثت کے شروع میں بھی اور بعثت کے آخر میں بھی، فرعون کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی، اور

اس واقعہ سے کہ ان کی قوم کسی اور قوم کی غلام تھی۔ ان کے پیغام اور ان کے کام میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ جو دعوت تمام انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوموں کو دی وہی دعوت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی۔ جو ذمہ داری ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار اور ملأ مستکبرین کو سنایا وہی ذمہ داری حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار اور ملأ مستکبرین کو سنایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسرے انبیاء کی قوموں کے ارباب اقتدار ان کی اپنی قوم کے اندر ہی کے لوگ ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار باہر کے یعنی قبطی تھے لیکن اس اختلاف سے کوئی ایسا جوہری فرق نہیں واقع ہوتا کہ ایک نبی کے اصول دعوت میں فرق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دعوت حق دی، ان سے مناظرے کیے، ان کو معجزے دکھائے، ان پر اللہ کی حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ ان کے اندر سے کچھ اہل حق ایمان بھی لائے لیکن جیسا کہ ہر نبی کی قوم کے ارباب اقتدار کی اکثریت نے نبی کی تکذیب کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے ملأ مستکبرین نے بھی ان کی تکذیب کی اور پھر جس طرح ہر نبی نے اپنی طرف سے اتمام دعوت اور مستکبرین کی طرف سے تکذیب اور قتل کی دھمکی کے بعد ہجرت کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے زمانہ کے مستکبرین کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد ہجرت فرمائی اور جس طرح ہر نبی کے جھٹلانے والے، نبی کی ہجرت کے بعد، خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعداء بھی ان کی ہجرت کے بعد گرفتار عذاب ہوئے۔ یہ ساری تفصیلات قرآن میں موجود ہیں ہر شخص قرآن کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ اس امر واقعہ کی وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کسی دوسری قوم کی غلام تھی نہ نبی کے فرائض رسالت کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ انبیاء کے لیے اور ان کے جھٹلانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے جو مقررہ قوانین ہیں ان میں سر مو کوئی فرق ہوا۔ ایک ہی ضابطہ جو آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا وہی ہم یہاں بھی جاری دیکھتے ہیں۔ اور فرق ہو بھی کیا سکتا تھا؟ مستکبرین کی نسل بدل جانے سے ان کی ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی ہوتی نہیں۔ قریش کے ارباب اقتدار ابوجہل اور ابولہب ہوں یا بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار فرعون و ہامان دونوں ایک ہی بیماری میں مبتلا تھے پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک کے پاس تو اللہ کا رسول یہ دعوت لے کر آئے کہ ایمان لاؤ، اور عمل صالح اختیار کرو اور دوسرے کے پاس محض بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ۔ آخر مستکبرین اور مستضعفین کی نسل مختلف ہونے کی وجہ سے خدا کے انبیاء کا رویہ کیوں بدل جائے؟ کیا العیاذ باللہ انبیاء بھی نسل و نسب کی اسی عصبیت میں گرفتار ہوتے ہیں جس میں ہمارے ہندوستان کے برہمن گرفتار تھے کہ شودر کے کان میں وید کا کوئی کلمہ نہ پڑنے پائے اور کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے کوئی نسلی پرخاش تھی کہ اگر وہ اللہ پر ایمان بھی لاتا جب بھی وہ یہی چاہتے کہ اس کی قوم الگ اور ان کی قوم علیحدہ رہے؟

اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وہی تھی جو ہر نبی اپنی قوم کو دیتا ہے۔ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت۔ کسی دوسری قوم کے زیر اقتدار ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرگز یہ نہیں کیا کہ ان کو نسلی عصبیت کے نعرے پر جمع کر کے پہلے فرعون سے آزادی حاصل کرنے کی دعوت دیں اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایمان و اسلام کا درس شروع کریں۔ ان کی مصر کی زندگی اور مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ یعنی مصر کی زندگی میں انھوں نے اپنی قوم کو صرف اصول دین کی تعلیم دی۔ عقائد میں سے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان کی۔ عبادات میں سے نماز اور قربانی کی۔ اخلاق و اعمال میں سے توکل، صبر، اور حق پر استقامت کی۔ اور

مصر سے نکلنے کے بعد ان سارے اصولوں کی تشریح فرمائی اور ان کے مطابق ان کی تربیت کی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کا تدریجی ارتقاء ہے جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی دعوت میں پاتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کی مکی اور مدنی زندگی بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دونوں دور بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ یہ ان کے اوپر نہایت بدترین تہمت ہے کہ وہ مصر میں تو نسل ونسب کے دعوائے جاہلیت کے علمبردار تھے، لیکن سینا میں آکر خدا کے داعی بن گئے۔ البتہ طبیعت میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام محض قومیت کے نعرہ پر لوگوں کو جمع نہیں کر رہے تھے بلکہ ایمان و اسلام کے اصولوں پر جمع کر رہے تھے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب وہ مصر سے نکلے تو ان کی ساری قوم ان کے ساتھ تھی۔ لیکن اولاً تو یہ بیان تورات کا ہے جس کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کی ساری تاریخ نسلی استحقاق اور خاندانی فضیلت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ ثانیاً یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کسی نبی کی تکذیب بھی کمزوروں اور مظلوموں نے نہیں کی ہے۔ صرف قوم کے ارباب جاہ نے کی ہے۔ بنی اسرائیل من حیث القوم ارباب جاہ میں شامل نہیں تھے، بلکہ مستضعفین یعنی مظلوموں میں تھے۔ ان کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں خدا کے اتنے عجائب اور اس کی قدرت کے اتنے کرشمے دیکھ کر بھی ایمان نہ لاتے ورانحالیکہ ان کو ایمان سے پھیرنے والے ارباب اقتدار اپنے مظالم اور اپنی نسلی عصبیت و اجنبیت کی وجہ سے اپنا اعتماد ان کے اندر بالکل کھو چکے ہوں۔ اور خوف کے سوا کوئی دوسری کشش بھی بنی اسرائیل کو ان کی طرف کھینچنے والی نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے یہ مدعا کا اجمالی بیان تھا۔ اب کسی قدر تفصیل سے اصل صورت حالات کو قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ اور پہلے یہ دیکھیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا وہ محض ایک نیشنلسٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کے پاس محض یہ مقصد لے کر گئے تھے کہ ان کی غلامی سے اپنی قوم کو چھڑائیں یا بحیثیت رسول کے اس حیثیت سے کہ ان کو خدا پر ایمان لانے، خدا سے ڈرنے اور اپنی زندگیوں کو پاک کرنے کی دعوت دیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی بات قرآن مجید نے یہ بتائی ہے:-

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا - (مزمل ۱۵، ۱۶)

ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک رسول تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی طرف گواہ بنا کر تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو سخت عذاب میں پکڑا

اس آیت میں مخاطب قریش ہیں۔ ان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول، دین حق کی دعوت دینے کے لیے بھیجا تھا، اسی طرح تمہاری طرف ایک رسول، اللہ کے دین کی دعوت کے لیے بھیجا ہے۔ فرعون نے اس رسول کی دعوت قبول نہ کی تو وہ عذاب میں پکڑا گیا، اسی طرح اگر تم اس رسول کی بات نہ سنو گے تو عذاب میں گرفتار ہو گے۔

اس سے چند باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔ پہلی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کے پاس اسی طرح رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون اور اس کی قوم کی طرف اسی طرح شاہد یعنی اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب

کی طرف اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تیسری یہ کہ فرعون اور اس کی قوم کا جرم بھی بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت صلعم کی قوم کا تھا۔ یعنی جس طرح قریش نے اللہ کے رسول کی دعوت نہ مانی اسی طرح فرعون اور اس کی قوم نے بھی اللہ کے رسول کی بات نہ مانی۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے بیان کر دی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان، تزکیہ اور خشیت الٰہی کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات)

فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہو کہ کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تو پاکیزگی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو اس سے ڈرے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اس کے اندر اگر نیک اور پاکباز انسان بننے کا کچھ دم داعیہ ہو تو اس کو پاکیزہ زندگی کا طریقہ بتائیں اور اگر خداشناسی کا کچھ میلان ہو تو اس کو خدا کی صفتوں اور اس کے حکموں کی تعلیم دیں تاکہ وہ خدا سے ڈرے۔ نیز اسی آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قرآن کی اصطلاح میں طغیان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں خدا سے بے پروائی پیدا ہو جائے۔

یہی بات ایک اور مقام میں بیان ہوئی ہے۔ اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ نہایت نرمی اور دلجوئی کے ساتھ فرعون کو تبلیغ حق کی جائے تاکہ تذکر اور خشیت کی راہ اختیار کرنے میں اس کے لیے داعی کی طرف سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیوں کو لے کر جاؤ اور میرا ذکر بلند کرنے میں ڈھیلے نہ پڑنا۔ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس کو نرمی کے ساتھ تبلیغ کرو تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام خود فرعون سے فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو اللہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ ہمارے پاس یہ وحی آئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر آئے گا جو جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا۔

"الہدیٰ" کے معنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے (قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى) جس سے صاف واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس صرف بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ اللہ کی ہدایت لے کر گئے تھے جس کو قبول کرنے کی صورت میں فرعون کے لیے اللہ کی رحمت تھی اور جس سے اعراض کرنے کی صورت میں اس کا قہر و عذاب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے توحید و معاد پر تقریر بھی کی ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ

اس نے پوچھا تمہارا رب کون ہے اے موسیٰ؟ جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پہلے اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کو ہدایت بخشی۔ پوچھا گذشتہ قوموں کا کیا حال ہے؟ جواب دیا ان کا حال میرے رب کے علم میں ہے ایک کتاب

رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ۔ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا
وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۔ كُلُوْا وَارْعَوْا
اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ۔ مِنْهَا
خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً
اُخْرٰى (طٰہٰ)

میں لکھا ہوا ہے، نہ میرا رب بھٹکے گا نہ بھولے گا۔ جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں، اور آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے پیدا کیں اس سے طرح طرح کی نباتات، کھاؤ اور چراؤ اپنے مویشیوں کو۔ بے شک اس کے اندر دلیلیں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے۔

. . . .

قرآن نے توحید پر بعض مناظرے بھی نقل کیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ قَالَ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ
قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ
اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ
اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ
اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (شعراء)

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ جواب دیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم یقین کرو۔ اس نے اپنے درباریوں سے کہا، سنتے ہو؟ کہا تمھارا بھی رب اور تمھارے پچھلے بزرگوں کا بھی رب۔ کہا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم سمجھو۔ بولا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید خانہ کے حوالہ کر دوں گا

فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ شکایت بھی تھی کہ یہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں سے نہیں سنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے جواب میں یہ فرماتے کہ میں تمھارے پاس اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہوں۔ یہ بعینہٖ وہی شکایت ہے جو ہر نبی کی قوم نے اس کی دعوت کے متعلق کی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی بعینہٖ وہی ہے جو ہر نبی نے قوم کے اس اعتراض کے جواب میں دیا ہے۔

وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ وَقَالَ
مُوْسٰى رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ
وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ

اور ہم نے تو یہ بات (توحید) اپنے اگلوں میں نہیں سنی اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوگی۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ اور فرعون نے کہا اے لوگو میں تمھارے لیے اپنے سوا کسی معبود سے واقف نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا جھگڑا فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا تو فرعون کے اس اعتراض کا کیا مطلب کہ حضرت موسیٰ آبا و اجداد کے طریقہ کے خلاف ایک بدعت پھیلا رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب کا کیا موقع پیدا ہوا کہ میں اگرچہ اپنی دعوت کی تائید میں آبا و اجداد کے طریقہ کی سند نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ کی سند رکھتا ہوں؟ اور پھر اس بات کی ضرورت کیا پیش آئی کہ فرعون اپنے تمام ارباب حل و عقد کو اس بات پر متنبہ کرے کہ میرے سوا کسی کو

الزام نا؟

اس سے زیادہ واضح بات ایک یہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جو سب سے بڑا اندیشہ تھا وہ یہ نہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہیں بلکہ یہ تھا کہ یہ کہیں اس کی قوم کا دین نہ بدل دیں اور ملک میں اس کی خدائی کے خلاف بغاوت نہ برپا کر دیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن)

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔

اور فرعون کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ قبطیوں کے اندر بہت سے لوگ کھلم کھلا حضرت موسیٰؑ پر ایمان لا چکے تھے جن میں سب سے زیادہ حق پرست اور جری وہ لوگ تھے جو اپنے سحر سے حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا مقابلہ کرنے آئے تھے اور با لآخر حق کی طاقت سے مغلوب ہو کر سحر سے تائب ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو فرعون کے جبر و ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر سے ایک شخص نے اس وقت اپنے ایمان کا اعلان کیا جب اس کی قوم نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا ہے اور اس وقت اس نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوت ایمان پر ایک تقریر کی ہے جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے۔ اس تقریر کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان اصلی کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے نہیں تھی بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالآخرت کے لیے تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ساری چیزیں ٹھیک انہی دلائل اور انہی تفصیلات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے پیش کی تھیں جن دلائل و تفصیلات کے ساتھ ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ اس پوری تقریر کو پڑھیے۔ یہ مرد حق، عین موقع کا گواہ بھی ہے اور آل فرعون میں سے بھی ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کے جس صورت میں پیش کرتا ہے وہ کتنی مختلف ہے اس صورت سے جس صورت میں ہمارے یہ بزرگان دین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش کر رہے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ڰ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاۗءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ

اور فرعون نے کہا ہٹو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو (اپنی مدد کے لیے) مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے ہر متکبر سے، جو روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑی۔ اور ایک مومن نے جو آل فرعون میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، کہا کیا تم ایک ایسے شخص کو قتل کرو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا ہے؟ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر آئے گا اور اگر سچا ہے تو جس عذاب کی دھمکی تم کو سنا رہا ہے اس کا

لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ
بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا
أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ
نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ
ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ۝ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝
يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ
يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ
مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ
حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا
كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ ۝ الَّذِينَ
يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ
مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ
أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي
لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا وَكَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ
وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۝
وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ
يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ
هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَيَا قَوْمِ
مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُونَنِي
لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا
أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي
إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنَّ

کوئی حصہ تم پر آ کے رہے گا۔ اللہ اس شخص کو کامیاب نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والا اور جھوٹا ہے۔ اے میری قوم کے لوگو آج تم کو اختیار حاصل ہے اور ملک میں غالب ہو (اس وجہ سے موسیٰ کو قتل کر سکتے ہو) لیکن اللہ کے عذاب سے ہم کو کون بچا سکے گا اگر وہ آگیا؟ فرعون نے کہا میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں (موسیٰ کے قتل کے بارہ میں) جو میرے نزدیک صحیح ہے اور میں ٹھیک راستہ کی طرف تمہاری رہبری کر رہا ہوں۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو (اگر تم نے موسیٰ پر ہاتھ اٹھایا) تو تم پر بھی ویسا ہی عذاب آئے گا جیسا کہ گزشتہ جماعتوں پر آیا۔ (اور وہی حال ہو گا) جو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور ان لوگوں کا ہوا جو ان کے بعد آئے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں چاہتا اور اے میری قوم کے لوگو مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایک پکار کا دن آ دھمکے جس دن تم پیٹھ پھیر کے بھاگو گے اور تم کو اللہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کی لائی ہوئی باتوں کے متعلق برابر شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو ہٹ دھرمی کرتے ہیں، ان کا رویہ اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے ہر متکبر اور سرکش کے دل پر۔ اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے ایک محل بنوا کہ میں بلندیوں پر پہنچوں، آسمانوں کی بلندیوں پر، اور موسیٰ کے رب کو دیکھوں۔ میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اسی طرح فرعون کی نظروں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ راہ حق سے روک دیا گیا اور فرعون کی مکاری کو تباہ ہی ہونا تھا۔ اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو کہ میں تمہاری رہنمائی راہ حق کی طرف کروں۔ اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے۔ ہمیشگی کا گھر تو آخرت ہے۔ جس نے کوئی بدی کی تو صرف اس کے مانند بدلہ دیا جائے گا اور

مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ
فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا
وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ٥ (المومن)

جس نے نیکی کمائی، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو وہی لوگ جنت میں جائیں گے اور اس میں بے حساب روزی پائیں گے۔ اے میری قوم کے لوگو کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف پکار رہے ہو؟ تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کا کسی ایسی چیز کو ساجھی قرار دوں جس کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تم کو خدائے عزیز وغفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ بلاشبہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں ہے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا تو اللہ کی طرف ہوگا اور زیادتی کرنے والے جہنم میں ہوں گے۔ تو اس وقت تم یاد کرو گے جو کچھ میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ بندوں کا نگران حال ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچایا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

یہ پوری تقریر جو عین فرعون کے دربار میں ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص نے کی ہے جو آل فرعون میں سے ہے بار بار پڑھیے۔ اس میں بیچ بیچ میں فرعون کی طرف سے مداخلتیں بھی ہوئی ہیں: ان کو بھی پیش نظر رکھیے اور پھر غور کیجیے کہ کیا فی الواقع حضرت موسیٰ اور فرعون کی یہ ساری کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے تھی یا یہ کفر و ایمان، توحید و شرک اور حب دنیا اور ایمان بالآخرۃ کی وہی کشمکش ہے جو ہر نبی اور اس کی قوم کے مستکبرین کے درمیان برپا ہوتی رہی ہے؟ اس میں تو بنی اسرائیل کی آزادی و غلامی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ نہ استغاثہ کی طرف سے نہ صفائی کی طرف سے۔ فرعون حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ یہ قوم کا (قبطیوں کا) دین بگاڑ رہے ہیں اور اس کی خدائی کے خلاف بغاوت برپا کر رہے ہیں اس وجہ سے مستحق ہیں کہ قتل کر دیے جائیں۔ یہ مرد حق اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا کہ وہ صرف اللہ واحد کو اپنا رب مانتا ہے، کوئی انصاف کی بات نہیں ہے، درانحالیکہ اس کے پاس خدا کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ زیادتی کی گئی تو اس کا وبال پوری قوم پر آ کے رہے گا۔ فرعون کہتا ہے رائے صائب وہی ہے جو میں دے رہا ہوں۔ مرد مومن اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس رائے پر عمل کیا گیا تو قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور دوسری معذب قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیے۔ پھر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ موسیٰ ہمارے پاس اسی طرح کی دعوت حق لے کر آئے ہیں جیسی حضرت یوسف لے کر آئے تھے لیکن آپ لوگوں کا دل ان کی دعوت پر بھی نہیں جما اور پھر اپنے لیے کسی رسول کی بعثت کی طرف سے آپ لوگ بالکل بےفکر ہو کے بیٹھ گئے اور اب اللہ کی آیات کے بارہ میں خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد اپنی پوری قوم کے سامنے آخرت پر، جنت و دوزخ پر، کفر و شرک پر نہایت موثر خطبہ دیتے ہیں اور لوگوں کو نجات کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر آخر میں ان سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد میری نصیحتوں کو یاد کرو گے اور اپنی غلطی پر پچھتاؤ گے۔ اس کے بعد اس بات کا بھی ذکر آتا ہے کہ ان کی قوم نے ان کے قتل کی بھی تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور اغلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انھوں نے بھی ہجرت فرمائی۔

اگر یہ سارا جھگڑا بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا اور کفر و ایمان اور شرک و توحید کے بجائے حاکم و محکوم محض اس بات کے لیے لڑ رہے تھے کہ محکوم قوم کو اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کا حق ملنا چاہیے تو اس طرح کی آویزش کا نتیجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ

قبطیوں کے اندر ایسے ایسے کامل الایمان اور صدیق پیدا ہوں۔ اس طرح کی نزاع، جو دو قوموں میں محض سیاسی برتری کے لیے برپا ہو اور جو خالص نسلی فرق و امتیاز کے مطالبات پر قائم ہو، اس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کی من حیث القوم دشمن ہو اور اس کے مذہب اور اس کی روایات سے نفرت کرے۔ اور اگر محض انسانی ہمدردی کے داعیہ کی وجہ سے کچھ افراد ایسے نکل بھی آئیں جن کو مظلوم کے مطالبات سے کچھ ہمدردی ہو جائے تو وہ ہمدردی زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کی ہو سکتی ہے جس طرح کی ہمدردی بعض نیک مزاج انگریز ہندوستانیوں کے مطالبات کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطیوں سے لڑائی تو محض بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے لڑیں لیکن اس لڑائی کے نتیجہ کے طور پر قبطیوں کے اندر اس طرح کے اہل الایمان پیدا ہوں جس طرح کے اہل الایمان آنحضرت صلعم کی دعوت سے قریش کے اندر پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ کی آخری بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے ہجرت اور فرعون اور اس کی فوج کا غرق ہونا ہے۔ جس وقت فرعون موجوں کے گھیرے میں آجاتا ہے اس وقت بے تحاشا اس کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو دعوت دے رہے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انتہائی جدوجہد کے باوجود وہ اس کے ماننے پر اڑا رہا۔ یعنی اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت۔

حَتّٰیٓ اِذَآ اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (یونس)

یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لایا اس بات پر کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جس پر ایمان لائے ہیں بنی اسرائیل اور میں اطاعت کرنے والوں میں ہوں۔ اب، حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں تھے۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان و اسلام کی دعوت لے کر نہیں گئے تھے، صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر گئے تھے تو اس کو آخری وقت میں ایمان و اسلام کے اقرار کے بجائے یہ کہنا تھا کہ "ہائے میری بدبختی، میں نے بنی اسرائیل کو رہا کیوں نہ کیا!" یہ ایمان و اسلام کا اقرار تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ساری کشمکش درحقیقت ایمان و اسلام کے لیے تھی نہ کہ بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے۔

ان تمام باتوں پر غور کیجیے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون اور اس کی قوم کے پاس اپنی قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ وہ دعوت لے کر گئے تھے جو حضرات انبیائے کرام ہمیشہ اپنی اپنی قوموں کے مستکبرین کے پاس لے کر گئے۔ یہ دعوت انھوں نے پیش کی۔ اس کے لیے انھوں نے مناظرے اور مجادلے کیے۔ معجزات دکھائے اللہ تعالیٰ کی حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ یہ حجت اس قدر واضح ہوئی کہ مستکبرین کے اندر سے جو لوگ نیک فطرت کے تھے انھوں نے بھی اس کو قبول کر لیا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس دعوت کو بلند کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ لیکن جب خود اپنے ضمیر کی آواز سن لینے کے بعد بھی فرعون اور اس کے مفسد ارکان و اعیان نہ صرف اپنے کفر و شرک ہی پر اڑے رہے بلکہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے انبیاء کے لیے

مقرر کر رکھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل ایمان کے ساتھ ہجرت فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم پر خدا کا عذاب آگیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت تمام انبیاء اور ان کے جھٹلانے والوں کے اندر جاری رہی ہے اور یہی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ دوسرے انبیاء اور ان میں اگر فرق ہے تو دعوت اور مقاصد دعوت میں نہیں ہے اور نہ دعوت کے مدارج و مراحل میں ہے۔ صرف اس بات میں فرق ہے کہ ان کی قوم کے مستکبرین و مترفین نسل کے لحاظ سے مختلف تھے اور دوسرے انبیاء کی قوموں کے مستکبرین خود انہی کے اندر کے تھے لیکن یہ کوئی ایسا جوہری فرق نہیں کہ اس کی وجہ سے نبی کی دعوت میں کوئی فرق پیدا ہو جائے۔ اور وہ اللہ کے رسول کی جگہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی پوزیشن اختیار کر لے۔

حضرت موسیٰؑ کا کام بنی اسرائیل کے اندر اب اسی طرح اس سوال پر غور کیجیے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اندر کیا کام کیا؟ کیا کفر و اسلام اور شرک و توحید کا سوال چھیڑے بغیر انھوں نے ہر اسرائیلی کو آزادی کے مطالبہ پر جمع کر لیا اور ان کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا یا تمام انبیاء کی طرح انھوں نے بھی اپنی قوم کو ایمان و اسلام کی دعوت دی اور جن لوگوں نے ان کی دعوت قبول کی انہی سے اپنی جماعت بنائی؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا وہ یہ ہے:-

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ○ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ

اور میں نے تم کو انتخاب کیا تو سنو وہ بات جو تم پر وحی کی جاتی ہے لاریب میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں پس میری ہی بندگی کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔ قیامت آکے رہے گی۔

یہ توحید، معاد اور قیام نماز کا وہی حکم ہے جو ہر نبی کو اول اول بطور اصول دین تلقین کیا جاتا ہے اور اسی کو لے کر وہ اپنی قوم میں جاتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ احکام ملیں اور وہ ان کی پروا کیے بغیر بنی اسرائیل کو محض نسلی عصبیت کے نعرہ پر، فرعون اور اس کی قوم سے آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے جمع کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ کی دوسری نہایت اہم آیت یہ ہے:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو یاد دلاؤ اللہ کی نعمت و نقمت کے دن۔ بے شک اس کے اندر ہیں دلیلیں ہر ثابت قدم اور شکر گذار کے لیے۔

اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لیجانا ہر پیغمبر کا فرض منصبی ہے اور تقریباً انہی الفاظ میں قرآن مجید نے ہر نبی کی صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی سے مراد عقائد و اعمال کی ظلمت اور روشنی سے مراد ایمان و اسلام کی روشنی ہے۔ اور جب اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قوم کو عقائد و اعمال کی تاریکیوں میں چھوڑ کر صرف اس کی سیاسی آزادی کی فکر میں پڑ جاتے۔

اب اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کاموں کو دیکھیے جو انھوں نے مصر کی بالکل ابتدائی زندگی میں اپنی قوم کے اندر کیے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ہ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ہ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ہ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ہ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ہ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

پس موسیٰ پر ایمان نہ لائے مگر اس کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ بے شک فرعون ملک میں مستبد اور زیادتی کرنے والا تھا۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلم ہو۔ انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالموں کے فتنہ کا نشانہ نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت سے کافروں کی قوم سے نجات دے۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوش خبری دو۔ اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال دیا ہے تاکہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں

....

یہ اس وقت کا حال بیان ہوا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت شروع ہوئی ہے۔ اس کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ مصر کی ابتدائی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد بنی اسرائیل کے جو افراد اکٹھے ہوئے تھے وہ کس دعوت پر جمع ہوئے تھے؟ ان کے سامنے اخلاق و عمل کے کیا اصول تھے؟ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے کس اعتبار سے علٰحدہ سمجھتے تھے؟ مصر کی زندگی میں ان کو خاص تربیت کس بات کی دی جارہی تھی؟ اور فرعون اور اس کی قوم سے ان کی لڑائی کس بات کے لیے تھی؟

الف۔ ان آیات سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے دعوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تھوڑے سے نوجوان ایمان لائے۔ اور انہی مومنین سے ان کی جماعت بنی۔ یہ نہیں ہوا کہ محض قومی نعرہ پر انھوں نے ہر اسرائیلی کو اپنے پیچھے لگا لینے کی کوشش کی ہو۔

ب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناسب موقع پر اپنے صحابہ کو ایمان و اسلام کے مقتضیات و مطالبات سمجھاتے رہتے تھے چنانچہ ابتدائی دور میں جب اندیشہ ہوا کہ فرعون کی طرف سے ان کے ساتھیوں پر سختیاں ہوں گی تو انھوں نے لوگوں کو ایمان و اسلام کی حقیقت سمجھائی کہ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ لیکر اٹھے ہو تو خدا پر پورا بھروسہ رکھو اور ان کے صحابہ نے یہ کہا کہ ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات سورہ اعراف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ بے شک ملک اللہ کا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے دے اور انجام کار کی کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے)

ج۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نسلی قومیت کے اختلاف کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم سے نجات نہیں چاہتے

تھے بلکہ قوم کافر کے ظلم وستم سے نجات چاہتے تھے (وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) جس کے معنی یہ ہیں کہ قبطیوں سے ان کی نزاع عقائد واصول کی نزاع تھی نہ نسل ونسب کی۔ اور سیاسی ومعاشی مفاد کی۔

د۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی ابتدائی زندگی ہی میں حکم ملا کہ مصر میں مختلف مسجدیں تعمیر کرکے اور (غالباً) اپنی مسجد کو مرکز بنا کر نماز کا اہتمام کریں۔ یہ وہی تربیت وتزکیہ ہے جو ہر نبی کی دعوت میں ہم کو سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم چیز کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔

ہ۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرنے والے اہل ایمان کو اللہ کی تائید ونصرت کی بشارت دو (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ) یہ نہیں کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو بشارت دو۔

و۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی ہے اس میں فرعون کی یہ شکایت نہیں کی ہے کہ اس نے اقتدار پاکر ان کی قوم کی خود مختاری چھین لی ہے بلکہ یہ شکایت کی ہے کہ (رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِكَ) اے پروردگار ان کا مال وجاہ اس لیے ہے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی دعوت نہیں ہے جو مکہ کی زندگی میں آنحضرت صلعم نے دی اور کیا یہ وہی تربیت نہیں ہے جو ہجرت سے پہلے صحابہ کو دی گئی؟ کیا ان واضح دلائل کے بعد بھی اس غلط فہمی میں پڑنے کا کوئی موقع ہے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کافر ومومن میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ ان کو بحیثیت بنی اسرائیل آزادی کے مطالبہ پر متفق کرنے کی کوشش کی؟

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم، بلا لحاظ کفر وایمان، مجرد نسلی قومیت پر مبنی ہوتی تو مشہور اسرائیلی سرمایہ دار، قارون، اس سے الگ نہ رکھا جاتا بلکہ جس طرح وطنی اور نسلی قومیت کی اساس پر اٹھنے والی تحریکیں برلا، ولمیا، بجاج اور سیٹھوں، مہاجنوں، بینکروں اور تعلقہ داروں کو اپنانے کی کوشش کرتی ہیں اور آسانی سے اپنا لیتی ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی نہایت آسانی سے اس کو اپنی تحریک کا ایک لیڈر بنا لیتے لیکن ہوا یہ کہ آل فرعون کا ایک مومن جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم میں داخل ہو جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کا یہ "سب سے بڑا آدمی" فرعون وہامان کے زمرہ میں داخل کر دیا جاتا ہے وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ (اور قارون، فرعون اور ہامان کو یاد کرو۔ ان کے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں سرکشی کی اور ہم سے بھاگ نہ سکے) دوسری جگہ ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی حجت کے ساتھ، فرعون وہامان وقارون کی طرف تو انھوں نے کہا یہ جھوٹا ساحر ہے) اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اپنی قوم کے اس سب سے بڑے آدمی پر یہ الزام نہیں لگاتے کہ یہ "سرکار پرست" ہے، "قومی غدار" ہے، "رجعت پسند" ہے، "اسرائیلی لیگ کا دشمن" ہے بلکہ اس پر یہ الزام ہے کہ "خدا کا باغی" ہے، "مغرور ومتکبر" ہے، "آخرت کا منکر" ہے، خدا کی نعمتوں کو اپنی لیاقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اس کو جو دعوت دی گئی وہ بھی یہ نہیں ہے کہ اگر اسرائیلی ہے تو بنی اسرائیل کے ساتھ آ۔ اگر "ہماری قوم میں سے

ہے تو قوم کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لے" بلکہ اس کو یہ دعوت دی گئی کہ "زمین میں غرور نہ کر" "اللہ کی نعمتوں کو حصول آخرت کا ذریعہ بنا" "جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو خلق پر احسان کر" "زمین میں خدا سے بغاوت نہ کر"۔ سورہ قصص میں یہ پوری تفصیل پڑھ لیجیے۔ ہم صرف چند آیتیں نقل کریں گے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یاد کر جب اس سے اس کی قوم نے کہا (یعنی قوم کے اہل ایمان نے) اترا مت، اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو نعمت تجھے خدا نے دے رکھی ہے اس میں دار آخرت کا سامان کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ۔ اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بولا یہ سب تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے۔

ایک دن اس کی شان و عظمت دیکھ کر بنی اسرائیل کے بعض کمزور لوگوں نے جب یہ خواہش کی کہ کاش یہی شان و عظمت انھیں بھی حاصل ہوتی تو اہل ایمان نے انھیں سمجھایا کہ "وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ" (تم پر افسوس ہے، اللہ کا اجر اس سے بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے اور یہ حکمت صرف صابروں کو ملتی ہے) پھر قارون کی ساری عظمت و شوکت کی تباہی کا جب تماشا دیکھ لیا تو وہی لوگ جو اس کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، پکار اٹھے "لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ" (کافر فلاح نہیں پاتے) اس سے معلوم ہوا کہ قارون سے، باوجود یکہ وہ ایک اسرائیلی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اختلاف محض کفر و ایمان کی بنا پر تھا۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کے کفر و ایمان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور صرف اسرائیلیت کی اساس پر انھوں نے بنی اسرائیل کی تنظیم محض اس مقصد کے لیے کی کہ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے آزاد کر لیں؟

مصر کی ابتدائی زندگی میں، بعثت سے پہلے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ایسا فعل صادر ہو گیا جو قومی غیرت و حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت محمود تھا اور اگر وہ ایک نیشنلسٹ لیڈر ہوتے تو ان کا یہ کام نہایت شاندار کارناموں میں گنا جاتا کیونکہ قومی حمیت کے اعتبار سے کوئی شخص بھی اس کو مذموم نہیں قرار دے سکتا لیکن خدا کے انبیا کسی قوم کے حریف یا کسی قوم کے دوست بنکر نہیں آتے بلکہ صرف باطل کے حریف اور حق کے دوست بنکر آتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہی فعل، جو قومی حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت قابل فخر تھا، ان کی نظر میں شدید گناہ قرار پایا اور بار بار توبہ کرنے کے باوجود ان کے دل سے اس گناہ کی کھٹک نہیں نکلی۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ

اور موسیٰ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا کہ شہر کے باشندے ابھی غافل ہی تھے تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں ایک اس کی قوم

وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ

(بنی اسرائیل) کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں (قبطیوں) میں سے ہے تو اس سے مدد چاہی اس کی قوم کے آدمی نے اس شخص کے خلاف جو ان کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے تھپڑ مارا اور اس کا خاتمہ ہوگیا۔ موسیٰ فوراً پکار اٹھا یہ شیطانی کام ہوگیا بے شک شیطان کھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے معاف کر، تو اللہ نے اس کو معاف کیا، بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ پھر کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا ہے اس لیے اب میں مجرموں کا مددگار کبھی نہ بنوں گا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک قبطی سے لڑ رہا تھا آج ایک دوسرے قبطی کے ساتھ الجھا ہوا ہے اور اس نے ان کو دیکھتے ہی پھر مدد کے لیے پکارا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سختی سے ڈانٹا کہ "انک لغوی مبین" تو نہایت کھلا ہوا شریر ہے اور مجرموں کی مدد نہ کرنے کا جو وعدہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اس پر قائم رہے۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کی زندگی کا ہے جبکہ ان پر ایمان وعدل کے اصول ابھی الہام بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک غیور نوجوان ہونے کے لحاظ سے قومی حمیت ان کے لیے سب سے زیادہ قوی محرک ہوسکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان کی قوم مصر میں قبطیوں کے ہاتھوں اس سے زیادہ ذلیل ہو رہی تھی جتنے کہ امریکیوں کے ہاتھوں ریڈانڈین یا انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کسی قوم کے بحیثیت قوم حامی اور کسی قوم کے بحیثیت قوم حریف بننے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ سے صرف حق وعدل کا ساتھ دینے کا عہد باندھا اور اس عہد کی جانچ کا اتفاق سے دوسرے ہی دن جب موقع پیدا ہوگیا تو وہ اللہ کی توفیق سے اس عہد پر قائم رہے۔ غور کا مقام ہے کہ جو حضرت موسیٰ اپنی بعثت سے پہلے کی زندگی میں، اپنے اللہ سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں کسی مجرم کا حامی نہ بنوں گا، خواہ وہ میری قوم کا آدمی ہو، انہی حضرت موسیٰ پر ہمارے بزرگان دین یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعثت کے بعد کی زندگی میں اپنی قوم کے بحیثیت قوم حامی بن گئے۔ ان کے کافر و مومن، اور نیکوکار و بدکار میں انھوں نے کوئی فرق نہیں کیا۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کی صحیح تفسیر

اس ساری بحث کے بعد ان حضرات کی تیسری غلط فہمی سے تعرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ قومی آزادی کے ایک مقدس فریضہ ہونے کی ساری دلیل درحقیقت ان دو بنیادی غلط فہمیوں پر قائم تھی جن کی نہایت تفصیل کے ساتھ ہم تردید کرچکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کے کاموں کی صحیح نوعیت واضح ہوجانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ ایک ہی مقصد کی دعوت لے کر آئے۔ یعنی خالص اللہ کی بندگی اور اطاعت کی دعوت۔ ان سب کے نزدیک تمام نیکیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے اور تمام برائیوں کی جڑ خدا کی بندگی اور اطاعت سے انحراف ہے۔ ان کے نزدیک آزادی کا بھی مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کی گردن میں اللہ کی اطاعت کے سوا کسی اور کی اطاعت کا قلادہ نہ ہو اگرچہ وہ "اور" انسان کی

خود اپنی ہی قوم، یا اپنا ہی قبیلہ بلکہ اپنا ہی نفس ہو اور غلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ وہ غیر اپنی ہی قوم، اپنا ہی قبیلہ اور اپنا ہی نفس ہو۔ ان کے نزدیک یہ ظلم کبیر ہے کہ کوئی قوم کسی قوم سے بجبر اپنی اطاعت کرائے اور یہ ظلم اکبر ہے کہ کوئی قوم باختیار خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ دونوں ہی باتیں شرک ہیں اور انبیاء کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظلم کبیر کی مخالفت کریں اور دوسرے ظلم اکبر کو برپا کرنے کے لیے خود قیادت کا علم لے کر اٹھیں۔ پس اس بات کے لیے تو کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ جس فساد میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مبتلا تھے اسی فساد کا حق اپنی قوم کے لیے حاصل کرنے کی تحریک حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھائیں۔ وہ اگر کر سکتے تھے تو صرف یہ کام کر سکتے تھے کہ حاکم و محکوم دونوں کو احکم الحاکمین کی بندگی و اطاعت کی دعوت دیں۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ کام نہ کیا ہو۔ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی علٰحدگی کی کوئی وجہ اگر ہو سکتی تھی تو یہ نہیں کہ یہ علٰحدہ قوم ہیں اور وہ علٰحدہ۔ بلکہ صرف یہ ہو سکتی تھی کہ یہ مومن ہیں اور وہ کافر۔ دو قوموں کا مجرد نسلی اور وطنی امتیازات کی بنا پر الگ الگ اپنی حاکمیت کا علم گاڑنا تو وہ عصبیت جاہلیت ہے جس پر انبیاء لعنت کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں نہ کہ اس کی تحریک چلانے کے لیے۔ پس فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اگر ایمان لاتے اور اپنی حاکمیت کے دعوے سے اللہ واحد کے حق میں دست بردار ہو جاتے تو بنی اسرائیل اور وہ ایک باپ کے بیٹوں اور ایک خدا کے بندوں کی طرح ایک گھر میں بس سکتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر جھگڑا کس بات کا تھا؟ اس بات کا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کیوں حاکم ہیں، بنی اسرائیل کیوں حاکم نہیں ہیں یا اس بات کا کہ اللہ واحد کی حکومت کیوں نہیں ہے، فرعون کی حکومت اور خدائی کیوں ہے؟ اگر جھگڑا موخر الذکر بات کے لیے تھا اور یقیناً اسی بات کے لیے ہو سکتا تھا تو ٹھیک راہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے عہد کے مستکبرین کو دعوت ایمان و اسلام دیتے اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہی انھوں نے کیا اور ان کی دعوت کی یہی کشش تھی کہ فرعون کی قوم کے اہل حق ان کی بات پر ایمان لائے ورنہ اگر ایک نسلی نزاع ہوتی تو حضرت موسیٰ کی بات ان کے قومی دشمنوں کو کیوں اپیل کرتی؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو) اس کا مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کئی جگہ ان کے اس مطالبہ کا ذکر ہوا ہے لیکن جس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے واقعات ہر جگہ قرآن میں اختصار و اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اسی طرح یہ بات بھی اجمال ہی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ کسی جگہ بھی اس بات کی تشریح نہیں ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کس مقصد کے لیے اور کہاں لیجانا چاہتے تھے۔ البتہ اتنی بات قرآن مجید اور تورات دونوں سے واضح ہے کہ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالکل ابتدائی مطالبات میں سے ہے۔ ہمارے یہ علما، جو نیشنلزم کو بھی انبیاء کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں، کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو مصر سے نکال کر دوسرے ملک میں لے جانا چاہتے تھے لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول اور شاہد کے آئے تھے اور یہی حیثیت ان کی بنی اسرائیل کے لیے بھی تھی تو کوئی نبی اتمام حجت و دعوت کے بغیر، ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا جن کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہو۔ ہر پیغمبر کے فرائض رسالت میں سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں کو دعوت حق دے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے

اپنی دعوت کو قوم کے ایک ایک فرد کے کانوں تک پہنچائے۔ اور حق کو واضح کرنے کے لیے تمام ممکن وسائل استعمال کرے اور ایک مدت تک اپنی بہترین عملی سیرت اور بہترین قولی تبلیغ سے حق کو اتنا آشکارا کر دے کہ جو لوگ اس کا انکار کرنا چاہیں ان کے پاس ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور پناہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ سارے جتن کرنے کے بعد جب وہ ان کے قبول حق سے بالکل مایوس ہو جائے اور قوم اس کی جان کے درپے ہو جائے تب وہ اللہ کے اذن سے ان کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ لیکن اَرْسِلْ مَعَنَا کی جو تفسیر یہ حضرات کرتے ہیں اس تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ فرعون کے کفر و ایمان سے بحث تھی نہ بنی اسرائیل کی تعلیم و تربیت کوئی غرض تھی بلکہ وہ آنے سے پہلے ہی جانے کا پروانہ کرانے آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہنچتے ہی فرعون کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر۔ یہ بات تمام انبیاء کی سنت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم کیا جائے۔

ہمارے نزدیک اصول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے جو واقعات قرآن مجید میں مجمل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت کے لیے توریت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور توریت کا بیان اگر قرآن کے بیان یا اس کے کسی اصول کے خلاف نہ پڑے تو اس توضیح کو قبول کرنا چاہیے۔ اور بالخصوص ان مواقع میں تو توریت کا بیان بالکل غیر مشتبہ ماننا چاہیے جہاں کوئی بات مرتبین توریت کی خواہش کے بالکل خلاف مسخ و تحریف سے بچ رہے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ توریت میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی تاریخ بالکل ایک قومی آزادی کی جد و جہد کے رنگ میں پیش کی گئی ہے، اور اس کو پڑھتے ہوئے بار بار ایسا گمان ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ "میرے لوگوں کو جانے دے" تو ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ذوق کے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی ہی اپیل کرنے والی ہو سکتی تھی کہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر ان کی آزادی کا مطالبہ لے کر مبعوث ہو چنانچہ اپنی برتری کے نشہ میں انھوں نے بہت سی باتوں کو جو ایک بالکل ہی مختلف پہلو رکھتی تھیں، بالکل قومی رنگ دے دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ اَرْسِلْ مَعَنَا کی تفسیر توریت میں اس سے بالکل مختلف ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ اور تفسیر ایسی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا انکار کیا جائے۔ ہم پہلے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ اس کے متعلق توریت میں جو کچھ ہے اس کو پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں گے۔

توریت کی کتاب الخروج میں اس مطالبہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ بعض جگہ تو جس طرح قرآن مجید میں مجمل ہے اسی طرح تورات میں بھی مجمل ہے لیکن پھر دوسرے مقامات میں ایسی تفصیلات آگئی ہیں کہ پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔ کتاب الخروج باب ۳ ۱۸-۲۰ میں خداوند خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے یہ مطالبہ کرنے کا حکم دیتا ہے:-

"اب تو ہم کو تین دن کی منزل بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں اور میں جانتا ہوں کہ مصر کا بادشاہ نہ تم کو یوں جانے دے گا نہ بڑے زور سے۔ سو میں اپنا ہاتھ بڑھاؤں گا اور مصر کو ان سب عجائب سے جو میں اس میں کروں گا، مصیبت میں ڈالوں گا۔ اس کے بعد وہ تم کو جانے دے گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قربانی کرنے کے لیے، پوری قوم کے ساتھ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی منزل پر تھا۔ اس مقام کے بارہ میں محققین میں اختلاف ہے اور ہم یہاں اس بحث میں نہیں

پڑنا چاہتے۔ اس کے بعد اس کی کچھ مزید تفصیل آتی ہے۔

"خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں۔ فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر اسرائیل کو جانے دوں۔ میں خداوند کو نہیں مانتا اور میں اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے کہا عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے سو ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جاکر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں تا نہ ہو کہ وہ ہم میں دبا بھیجدے یا ہم کو تلوار سے مروا دے۔ تب مصر کے بادشاہ نے ان کو کہا اے موسیٰ اور اے ہارون تم کیوں ان لوگوں کو ان کے کام سے چھڑواتے ہو۔ تم جاکر اپنے اپنے بوجھ کو اٹھاؤ اور فرعون نے یہ بھی کہا دیکھو یہ لوگ اس ملک میں بہت ہو گئے ہیں اور تم ان کو ان کے کام سے بٹھاتے ہو اور اس دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم کیا کہ اب آگے کو تم ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ خود ہی جاکر بھس بٹوریں اور ان سے اتنی اینٹیں بنوانا جتنی وہ ابتک بناتے آئے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اسی لیے چلا چلا کر کہتے ہیں ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔" (خروج باب ۵ ۱ - ۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قربانی کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اجتماعی قربانی تھی اور اس کی حیثیت عید کی تھی جس میں بنی اسرائیل کے ہر خرد و کلاں کی شرکت مطلوب تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فرعون کو جس سبب سے ان کو جانے دینے سے انکار تھا وہ یہ تھا کہ جو کار خدمت ان لوگوں کے سپرد تھا اس میں ہرج ہوگا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہ تنگ آگیا تب ایک حد تک راضی ہوا۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور اپنے خدا کے لیے اسی ملک میں قربانی کرو۔ موسیٰ نے کہا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں۔ سو اگر ہم مصریوں کی آنکھوں کے آگے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں تو کیا وہ ہم کو سنگسار نہ کر ڈالیں گے؟ فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم بہت دور مت جانا۔" (خروج ۸: ۲۵-۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مصر سے باہر بیابان میں جاکر قربانی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گائے کی قربانی کرنا چاہتے تھے اور مصری گائے کو ہمارے ملک کے ہندوؤں کی طرح، مقدس اور معبود خیال کرتے تھے اور چونکہ ان کے ہاتھ میں پورا اقتدار تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے گائے کی قربانی مصر میں کی اور وہ بھی اجتماعی شکل میں تو مصری ان کو سنگسار کر دیں گے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ یہ اجتماعی قربانی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں قدیم سے جاری رہی ہوگی لیکن مصریوں نے گائے کے تقدس کی وجہ سے اس کو بند کر دیا ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قربانی کی تجدید کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس تجدید کی تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی لیکن چونکہ یہ اجتماعی قربانی تھی، جس طرح ہمارے یہاں عید اضحیٰ، اس وجہ سے آگے چلکر ایک اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔

"تب موسیٰ اور ہارون پھر بلائے گئے اور اس نے ان کو کہا جاؤ اور خداوند اپنے خدا کی عبادت کرو پر وہ کون کون ہیں جو

جائیں گے؟۔ موسیٰ نے کہا ہم اپنے جوانوں اور بڈھوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور اپنی بھیڑ بکریوں اور اپنے گائے بیلوں سمیت جائیں گے کیونکہ ہم کو اپنے خدا کی عید کرنی ہے۔ تب اس نے ان کو کہا کہ خداوند ہی تمہارے ساتھ رہے۔ میں تو ضرور ہی تم کو بچوں سمیت جانے دوں گا۔ خبردار ہو جاؤ، اس میں تمہاری خرابی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونے پائے گا۔ تم مرد ہی مرد جا کر خداوند کی عبادت کرو کیونکہ تم یہی چاہتے تھے اور وہ فرعون کے پاس سے نکال دیے گئے۔" (خروج ۱۰: ۸-۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ یہ قربانی، ہماری عید اضحیٰ کی طرح، عام قربانی کے ایک تہوار کی تجدید تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ اس میں پوری قوم کو شرکت کی اجازت دی جائے اور قربانی کے لیے جانور بھی لے جانے کی اجازت دی جائے۔ فرعون نے بالآخر، خدا کے عذاب سے تنگ آ کر مطالبہ کا پہلا حصہ منظور کیا لیکن دوسرے حصہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"تب فرعون نے موسیٰ کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور خداوند کی عبادت کرو فقط اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کو یہیں چھوڑ جاؤ اور جو تمہارے بال بچے ہیں ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ موسیٰ نے کہا تجھے ہم کو قربانیوں اور سوختنی قربانیوں کے لیے جانور دینے پڑیں گے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے آگے قربانی کریں سو ہمارے چوپائے بھی ہمارے ساتھ جائیں گے اور ان کا ایک کھر تک بھی پیچھے نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ ان ہی میں سے ہم کو خداوند اپنے خدا کی عبادت کا سامان لینا پڑے گا اور جب تک ہم وہاں نہ پہنچ جائیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لے کر ہم کو خداوند کی عبادت کرنی ہو گی۔" (خروج ۱۰: ۲۴-۲۶)

بالآخر یہ قصہ یہاں تک بڑھا اور مصر اس اثنا میں خداوند تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آفتوں سے اس قدر تباہ ہوا کہ مصریوں نے فرعون پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو مصر سے یکقلم نکال دیا جائے۔ چنانچہ یہی مطالبہ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا سبب بن گیا

"تب اس نے رات ہی رات موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر لوگوں میں سے نکل جاؤ اور جیسا کہتے ہو جا کر خداوند کی عبادت کرو اور اپنے کہنے کے مطابق اپنے بھیڑ بکریاں اور گائے بیل بھی لیتے جاؤ اور میرے لیے بھی دعا کرنا اور مصری ان لوگوں سے بضد ہونے لگے تاکہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔ سو ان لوگوں نے اپنے گندھے گندھائے آٹے کو بغیر خمیر دیے لگنوں سمیت کپڑوں میں باندھ کر اپنے کندھوں پر دھر لیا۔"
(خروج ۱۲: ۳۴-۳۵)

"اور انھوں نے اس گندھے ہوئے آٹے کی جسے وہ مصر سے لائے تھے بے خمیری روٹیاں پکائیں کیونکہ وہ اس میں خمیر دینے نہ پائے تھے اس لیے کہ وہ مصر سے ایسے جبراً نکال دیے گئے کہ وہاں ٹھہر نہ سکے اور نہ کچھ کھانا اپنے لیے تیار کرنے پائے۔" (خروج ۱۲: ۴۰)

بنی اسرائیل کو مصر سے جبراً نکالنے کے بعد ان کے تعاقب کی وجہ توریت میں یہ بیان ہوئی ہے:-

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا۔" (خروج ۱۴: ۵-۶)

توریت کے ان بیانات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ یہ آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اجتماعی قربانی کی جو عبادت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے وقت سے جاری تھی[۱] اور جو مصر میں، گائے کے تقدس کی وجہ سے، بند کر دی گئی تھی اس کی تجدید کا مطالبہ تھا۔ یہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل اپنے پاس ایک دین رکھتے تھے، جس میں ہر چند، مصر کی غلامی کی وجہ سے، بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، لیکن وہ انبیاء کا دین تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تجدید کی جدوجہد کریں۔ بنی اسرائیل کے یہاں عبادات میں قربانی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ اور یہ اہمیت اس وقت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ حاکم قوم کی طرف سے وہ جبراً روک دی گئی ہو۔ اس وجہ سے اس کو زندہ کرنے کی کوشش ان کے مقدم ترین فرائض میں تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف تو حاکم قوم کو دعوت ایمان و اسلام دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوائے حاکمیت سے احکم الحاکمین کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو اللہ کی بندگی و اطاعت کی دعوت دی اور کوشش کی کہ ان کو اس بندگی و اطاعت کے لیے پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ اگر حاکم قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لیتی تو سارا جھگڑا ختم تھا۔ لیکن جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ کے مستکبرین نے اپنے نبیوں کا انکار کیا اور اتمام حجت کے بعد ان کو ہجرت کرنی پڑی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مستکبرین نے بھی ان کا انکار کیا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہجرت کر گئے جو ان پر ایمان لائے۔ ان ایمان لانے والوں میں مصری بھی تھے اور اسرائیلی بھی۔ اور جن لوگوں نے ان کی تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے اور ان تباہ ہونے والوں میں بھی دونوں ہی شامل تھے۔ اسرائیلی بھی اور قبطی بھی۔ البتہ بنی اسرائیل من حیث القوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ارباب اقتدار میں نہیں تھے کہ مفاد پرستی اور غرور ان کے ایمان کی راہ میں حائل ہوتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر دین حق کے اجزا موجود تھے جو مصر کی زندگی میں دب تو ضرور گئے تھے، لیکن فنا نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کے لیے بیگانہ چیز نہیں تھی۔ اس کے بالکل برعکس قبطی ملأ مستکبرین کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ، جو بیدار ضمیر رکھتے تھے، ایمان لائے[۲]۔

اس پوری بحث کو ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے بعد، غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ

---

[۱] ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی اجتماعی قربانی بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ سے جاری تھی لیکن یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

[۲] یہاں کسی کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غیر قبطی ہونے کی وجہ سے قبطیوں پر حجت تمام نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اسرائیلی تھے لیکن ان کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ ان کی زبان اور روایات ہر چیز سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ قبطیوں کے لیے اسی طرح رسول تھے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام۔ (امین احسن)

کر رہے ہیں جو وطنی یا تہذیبی اشتراک کی بنا پر ہندی نیشنلزم یا مسلمان نیشنلزم کا فتنہ اٹھا رہے ہیں اور انگریزوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ جو فساد دنیا میں تم کر رہے ہو وہ فساد کرنا ہمارا بھی "پیدائشی حق" ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی جماعت اسلامی کر رہی جو حاکم و محکوم دونوں کو صرف احکم الحاکمین کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے اور تمام بنی آدم کو یکساں پکار رہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی بندگی جائز ہے نہ اطاعت؟ اور پھر اس بات پر غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کو مسلمان قوم کے نعرہ پر جمع کر رہے ہیں قطع نظر اس سے کہ ان میں کون اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتا ہے اور کون نہیں یا جماعت اسلامی کر رہی ہے جو مسلمانوں کے اندر ایمان و اسلام اور توحید و آخرت کے مقتضیات کا شعور پیدا کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کی تربیت کرنا چاہتی ہے؟

آخر میں محترم مستفسر نے مسلم شریف کی جو روایت نقل کی ہے اس کے متعلق گزارش ہے کہ اس سے زیادہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر کوئی تربیت یافتہ جماعت جہاد کے لیے اٹھ رہی ہو تو وہ اپنے ساتھ بعض ایسے افراد بھی لگا لے [illegible] حرج نہیں جن کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو لیکن اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ ناتربیت یافتوں کی ایک فوج مرتب کر کے جہاد کیا جا سکتا ہے۔ بدر کی لڑائی جن لوگوں کے ذریعہ سے لڑی گئی وہ پوری تاریخ انسانی میں نوع انسانی کے گل سرسبد تھے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ناتربیت یافتہ نومسلم بھی شامل ہو گیا تو اس سے کیا بن بگڑ سکتا تھا!

تبلیغی پمفلٹ

سلامتی کا راستہ	۶؍	ایک نہایت ہی اہم استفتاء	۲؍
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶؍	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶؍
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶؍	دین حق	۶؍
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶؍	نشان راہ	۶؍
اسلام اور جاہلیت	۶؍	جہاد فی سبیل اللہ	۶؍
نیا نظام تعلیم	۶؍	دستور جماعت اسلامی	۲؍

انگریزی مطبوعات

(1) Towards Understanding Islam .. .. Rs 3/-

(2) What is Islam? .. .. Rs 1/8/-

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

فریضۂ اقامت دین

از

جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

(۳) گرفتاران یاس دائمی

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں اور ترک فرض اور فراموشیٔ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی، یہاں صاف گوئی اور "جرأت" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یکرنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلت حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس "اظہار جرأت" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیا کُشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں! ایک طرف اقامت دین کی اس اہمیت کو سامنے رکھیے کہ اسلام اور قیام دین کی سعی و جہد میں باہم وہی تعلق ہے جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکت قلب میں ہے، جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، پھر اس کے بعد ان لوگوں کی ان ـــ بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ ـــ باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجیے کہ "یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آ سکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔" توقع ہے کہ اس تجزیے سے آپ پر بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی جو ہم کہنی چاہتے ہیں۔ جب اقامت دین کی جد و جہد سے برضا و رغبت کنارہ کش ہو کر، اور باطل کے مقابلہ اور منکرات کے احوال میں عدم مداخلت اور صلح کل کی پالیسی اختیار کرکے انسان پیروان اسلام کی صف پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لیے بے تعلق نہیں کر سکتی اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اسلام نے دنیا کو کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" اور "تقدیر سے لڑنے" سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ قائم نہ رہ سکی اس کے لیے کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے"۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول، اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع سے اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو کبھی زمانہ دراز تک برقرار نہیں رکھا جا سکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس شے کو اس لیے اپنا مقصد زندگی ٹھیرایا ہے کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟ اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے نہ کوئی مطالبہ ہے نہ آپ پر کسی جد و جہد کے ترک کرنے کا الزام، لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے، تو ایک کافر بھی آپ کو یہ طرز استدلال اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا، تیس اور چالیس برس تو نہیں اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ بھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیے، اس لیے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے، یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا گیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی "اس دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد سے سبکدوش کر دینے کے لیے کافی ہے تو ہم گذارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دیدیجیے، اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجیے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابو ذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان ہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں اس لیے اب ایسے معیار دینی کا ذکر اور خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات کے لیے سعی و جہد کرنا بالکل لاحاصل ہے، یہ "ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے"۔ اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلت عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی

(حاشیہ صفحہ ۶۰) لہ اس موقع پر "امکان و عدم امکان" "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "اقامت دین کے سلسلہ میں بندوں کی ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو گذشتہ نمبر میں گذر چکی ہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ (ص)

زندگی میں بھی اس استحقاق معذرت کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابوبکر بھی پیدا نہیں ہوتا ہے آپ نہ صرف خود کمال ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں، تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعت دین کے ادارے کھولتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے، کہ قرآن کا معیار مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ آپ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل العیار اور اعلیٰ نمونے تھے، ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم نہیں پیدا کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں۔ بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہو سکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں، تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے اس حد تک اس رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقام ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ ہم اس طرز فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری گذارش بالکل اسی مرکز فکر پر مبنی ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافت راشدہ کے اوراق تاریخ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ابوبکر اور عمر اور عثمان وعلی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت اور ان کی نیابت رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوت قرآنی کے علم بردار اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیر القرون میں چھا گیا تھا حتیٰ لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ پس اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لیے مثال اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمال جہاں آرا کے عشق سے ہمہ دم اپنے سینوں کو گرم رکھیے۔ حیف ہے اگر اسی نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح و سعادت صرف دین حق کے قائم ہونے ہی پر مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جبکہ دنیا میں خلافت راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دل اس افسانۂ کہن کو از سر نو عالم واقعات میں دیکھنے کے لیے ٹھیک اسی طرح بے قرار رہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں، بلکہ تصورات کا ایک بتکدہ ہے۔

نظام اسلامی پر ایک شدید بہتان

سطور بالا میں ہم نے اسلام کے انفرادی اور اجتماعی معیاروں پر جو اشارات کیے ہیں ان سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روئے زمین پر صرف تیس سال نظام اسلامی کو برقرار سمجھنا تاریخ اسلامی کے

غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر پیدا ہوتے رہے تو ان کی خلافتوں کے بعد بھی نظامِ اسلامی قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں۔ اور اس دورِ سعید کے ختم ہونے کے بعد جس طرح شخصیتیں ناقص تھیں، مگر پھر بھی مسلمان تھیں، اسی طرح اس وقت کے نظامہائے اجتماعی بھی ناقص تھے مگر پھر بھی بالکل غیر اسلامی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح نظامہائے سیاست کے بھی دینی نقطۂ نظر سے مختلف مدارج ہوتے ہیں، جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ خود اسی زمانۂ خلافتِ راشدہ کے تمام ادوار اپنی روح میں یکساں نہ تھے بلکہ عثمانی اور علوی دورِ خلافت، صدیقی اور فاروقی ادوار سے فروتر تھے جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے اسی طرح دورِ خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچہ پر سخت سے سخت تنقید تو کر سکتے ہیں اور اس کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہہ سکتے ہیں مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر اس کو بالکل غیر اسلامی قرار دیدیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق ضعیف الایمان اور گنہ گار انسانوں کی ہدایت و ارشاد کا فرض ادا کرتے تھے اسی طرح حکمرانِ وقت اور اس کے سیاسی نظم و نسق پر بھی اظہارِ نکیر کرتے رہے اور افراد کی طرح حکومتوں کی اصلاحِ احوال کی کوشش بھی ان کی زندگی کا مستقل مشن تھا۔ لیکن انھوں نے کسی زمانہ میں کسی حکمران کے خلاف یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ اس کی حکومت سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ ہاں اس کے اندر جو بگاڑ تھا اپنی مقدرت کے مطابق اس کے سدھار کی سعی کرتے رہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی مدتوں جو نظامِ سیاست ممالکِ اسلامی میں جاری رہا وہ کبھی نہ کسی حد تک اسلامی تھا۔ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتی تھیں، سزائیں آئینِ شرع کے ماتحت دی جاتی تھیں، جائدادیں احکامِ دین کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں، غرض زندگی کے عام معاملات میں اقتدارِ عملاً کتاب و سنت ہی کو حاصل تھا، جو کچھ خرابی بھی حکمرانوں کی ذات میں بھی تھی مگر نظامِ دین کی بالادستی اس طرح گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا پُر جلال وقار، ذہنِ عام کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان حکمرانوں کو بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کارروائی انجام دینے کے لیے چہرے پر تشرع کی نقاب ڈالنی پڑتی تھی اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دیں۔

استدراک لیکن ہماری اس تقریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ان تمام حکمرانوں کی حکومتوں کو خالص اسلامی نظام سمجھتے ہیں اور اقامتِ دین کا فرض یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون الرشید کی طرح کی کوئی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتے اور اس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں، بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد بھی ایک مدتِ دراز تک اللہ کا دین دنیا میں قائم و نافذ رہا، اگرچہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی۔ اسی لیے اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دینا کہ یہ نظام صرف چند دنوں ہی قائم رہا، نہ صرف اسلام سے لوگوں کو دور کرنا ہے بلکہ تاریخی بددیانتی بھی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے علمی، دماغی، مالی اور جسمانی ذرائع سے کام لیتے ہوئے اپنے اس

مقصد زندگی کی خاطر مسلسل جد و جہد کرتے رہیں۔ نمونۂ کمال کے طور پر سامنے خلافت راشدہ کی مثال ہو، پھر اس مثال کی جاں تک عملی پیروی ہماری حد استطاعت میں ہو اسے سرانجام دے دیں، بس اسی پر ہماری مسئولیت ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح صدیق و فاروق بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کے نمونوں کو سامنے رکھکر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ان سے مماثلت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے؛ اسی طرح، بہرحال، ان ہی کی طرح کی خلافت قائم کر دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کردہ خلافتوں سے بیش از بیش مشابہت رکھنے والا نظام اجتماعی قائم کرنے کی سعی کریں اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہیں۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے افکار و اعمال کا جائزہ لیجیے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثبات قدمی اور تیزگامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود میدان سعی و عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی ترک کر دیں گے اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل داور محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹے اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی صداؤں اور امام محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس طرز فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجیے کہ زید اقامت دین کی دعوت دے رہا ہے اور ان لوگوں کو، جو اتباع قرآن اور علمبرداری اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر، اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرض زندگی یاد دلا رہا ہے اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر نااہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لیے حق مانا ہے کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصد زندگی تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں اور اپنی خوابگاہوں سے باہر قدم نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطور خود ہر حال میں ذمہ دار اور مسئول ہے، تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے۔ دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے

آپ اس کھود کرید کی زحمت بلاوجہ کیوں اٹھاتے ہیں، آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجیے۔ ہاں اگر ان کے حالات سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجیے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا "تم نے ادب کس سے سیکھا" جواب دیا "بے ادبوں سے" مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے اور ایسی ہی حق بیں، عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر دیا ہے کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں، اس لیے آپ کا اس صورت حال میں جو فرض ہونا چاہیے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی خامیوں، ظاہر داریوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للّٰہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں اور اگر ہو سکے تو ان کے لئے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا بھی کرتے جائیں کہ بہر حال ان کی چیخ پکار، اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی لقلقے" تھی مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکّر ثابت ہوئی، اس لیے وہ آپ کے شکریے کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت کے کہ ان کے انہی زبانی لقلقوں" نے غفلت کے پردے چاک کر دیے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرِراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو، آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہیے مگر اس پر آوازے کسنے اور اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی، اور اس کی پروا نہ کرنے میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور دیوانگی ہے۔ سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ پس اقامت حق کی پکار سن کر ان بندگان خدا کا طرزِ عمل اختیار کیجیے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت جو ہوں اور جن کی تعریف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:-

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ — جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

. . . .

اس لیے اس "قول" —— دعوت اقامت دین —— پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ آیا وہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے احسن ہونے میں کوئی شبہہ نہیں اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضۂ زندگی ہونا شک و ریب سے بالاتر ہے تو پھر اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسول ؐ اور اصحاب رسول کے مجاہدات اقامت دین کے سلسلہ میں یہی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کے واسطے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جانفروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو چل کر اپنے فرض کو ادا کر لیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں

آملتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے۔ (اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ)

غور فرمائیے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لیے آمادۂ عمل نہیں ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اُس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرزِ عمل کی اساس تھی؛ جس طرح وہ حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں۔ لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

بدبختی کی انتہا کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا، مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباعِ قرآنی اور عشق محمدی کی دعویدار امت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعتِ ہمایوں کے انتظار میں شوقِ مجسم بنے بیٹھے ہیں جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور انھیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو قیام دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث و مشکلات خود ہی ان کا فاتحہ پڑھ دیں گے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشترِ طعن کی زد خود ان کی اپنی رگِ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیام دین کی حسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا اور نہ اس کی نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ، دینِ حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے جو صرف مساعی کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھیں۔ حالانکہ اگر میرے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے لیے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کروں۔ لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے، اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس دعوتِ حق کو فتنہ قرار دے دوں، لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہوگی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیے کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہوں گا جہاں سے کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے فداکار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:-

..... یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ (توبہ - ۱۰) یہ لوگ تمہارے نذرِ آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یا پھر وہاں، جہاں سے پیغمبرِ عالم کی دلنشیں اور مسحور کن صدائے حق کو یہ کہکر ٹالا گیا تھا کہ:-

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (طور-۳) یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے، ہم اس کے لیے حوادثِ روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں

پس جنھیں اللہ نے عقل دی ہے انھیں پوری سنجیدگی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اس طرزِ عمل پر غور کرنا چاہیے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ "آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافتِ راشدہ کے ختم ہو جانے اور پھر قربِ قیامت میں امام مہدی کے ہاتھوں اس کے از سرِ نو قائم ہونے کی خبر دی ہے۔" اور نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں۔" دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل جو مسلمان کی زندگی کا مطمحِ نظر ہی بدل دے سکتی ہے۔ ضرورت تو نہ تھی کہ اس قسم کی مہمل باتوں کی تردید میں وقت، کاغذ اور روشنائی کا ضیاع برداشت کیا جاتا مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیانِ علم اور اربابِ تقویٰ کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے اس لیے انھیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تاکہ جس کو ترکِ فرض کی ہلاکت خریدنی ہو پورے علم و شعور کے ساتھ خریدے۔

روایاتِ مہدی کی حیثیت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہورِ مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائقِ دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟ سو ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اگر تعلیماتِ دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت، جو ہماری زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقلِ عام چاہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لے دے کر اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے مگر یہ روایتیں بھی اس پایہ کی ہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتبِ احادیث میں سے کسی ایک کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں۔ نہ امام بخاری نے ان کو درخورِ اعتنا سمجھا، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے، صرف بعد کے طبقہ کی کتابوں میں یہ دکھائی پڑتی ہیں، لیکن جب ان کو محدثانہ معیارِ تحقیق پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے تو ایک روایت بھی ٹھیک ثابت نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں ہیں اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہورِ مہدی کی پیشگوئی کی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامتِ دین کے فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دورِ مبارک آئے گا جب سطحِ زمین کے ایک ایک گوشہ سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر و طاغوت کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے؟ اس بیچ میں کوئی دور کا بھی

اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب وہی بہار سعادت پھر آگئی جو خیر القرون میں تھی، اور اس دور کو بھی خلافت راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی روایات ہیں اسی پایہ کی دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ پیشگوئیاں کی گئی ہیں کہ مہدی موعود کے علاوہ، اور ان سے پہلے، اور بھی علمبردارانِ قیامِ دین اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) اذا رأیتم الآیات السود قد جاءت من قبل خراسان فأتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیها خلیفة الله المهدی

جب تم یہ دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا — اگرچہ تمھیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے — اس لیے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

(۲) یخرج رجل من وراء النهر یقال له الحارث حراث علی مقدمته رجل یقال له منصور یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول الله وجب علی کل مسلم نصره (ابوداؤد)

ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیشرو (ہراول) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد کے لیے قوت و اقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لیے کیا، اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی مہدی موعود ہیں کیونکہ مہدی موعود کا ظہور، حسب بیان روایات، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے، اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث"، نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں، بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، صرف بعض افراد اور زمانوں کا ذکر آیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے کو پیش کر دے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پائندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چل کر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو زمین زندگی کا ہے۔ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور اس کی خاطر جد و جہد کرنا اس کے ایمان کا معیار و مظہر ہے اور جب کہ مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں موجود ہو اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ انسان کا پائے سعی و جہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دین الٰہی کی ایک

دفعہ بھی معطل ہے اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے تو ہر مومن کو یہ جدوجہد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے لیے ہو گی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ ان کا کوئی فعل کسی بھی مدعیٔ اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا۔ نہ تو وہ کسی دوسرے کے لیے نماز پڑھیں گے، نہ روزے رکھیں گے اور نہ ہی جہاد و قتال کریں گے۔ آپ آج ہی ان کی مساعی پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جبکہ ان کا وجود ابھی عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجیے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانے میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح امام موصوف کو۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں "ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب امام مہدی اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا عدل و قسط کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گی مگر ایک لمحے کے لیے بھی اس کو اس وہم میں نہ مبتلا ہونا چاہیے کہ حضرت موصوف علیہ السلام کے صدقے میں اب سارے مسلمان بندگی کی ذمہ داریوں یعنی اقامت دین کی جدوجہد سے سبکدوش کر دیے گئے ہیں، جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہم کو حسن عمل سے بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت اقامت دین سے دامن بچانے والے مسلمانوں کے یہ پانچ مختلف گروہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو بیان کر کے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا جائے گا اور روایتی، گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ یاد رہے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نامطلوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے، اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو، صرف جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات و حسیات کی بھی، پندار علم و فکر کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی۔ اکثر اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی چمکتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے، ادھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے اقطاب و ابدال اور وقت کے مراکز علم و دانش جن سمتوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دعوت حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:-

بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا — ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیے اور اس

اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے ـــ بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ ہی کوئی جماعت ہے ـــ سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے ـــ اس لیے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور اصحاب رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے اگر ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہو کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیے، نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت، نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی جماعت کا تعصب۔ نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ میں آڑے آنا چاہیے نہ کسی فکر سابق کی عصبیت کو، کہ یہ سب چیزیں نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے گوش و چشم پر صرف اس لیے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کرکے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے، ورنہ یاد رہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کی پچ میں یا اپنے جماعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت میں یا بزرگوں کی تقلید میں اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ تذرِ ہلاکت کرنا ہے، کسی بزرگ کا طرزِ عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔ جب تک یہ رازِ حق دل پر نہ کھلا ہو، انسان کسی حد تک تو معذور تصور کیا جاسکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کرلیا تو بس یوں سمجھیے کہ اللہ کی حجت تمام ہوگئی۔ اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں، اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے یا پھر انکارِ فرض و حصول نامرادی۔ کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

جب فرعون اور اس کے پیروؤں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کو ماننے سے انکار کردیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سنت کے پیرو ہیں اور ـــ "ظلم وعلو" نہ سہی ـــ گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پر چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا، ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعترافِ حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے الٹا سخت کردیگا۔

آخری گذارش ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نے جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے، جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے، ان کو از سر نو اپنا مرکز عمل بنائے اور حالات زمانہ، مشکلات ماحول اور مصالح وقت سے صرف نظر کرکے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کیے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کرکے، اپنے چھوڑے ہوئے فرض زندگی کو سرانجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ان کے لیے آخری چارۂ کار، جس کو برداشت کیا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں اور کم از

دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم میں اس راہ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں مگر حق اور نجات کی شاہراہ ہے یہی۔ یہ اس لیے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ ماخوذ ہوں۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں مگر خدارا دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔ یہ "صدعن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجانے چاہئیں۔ یہ بعینہ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہوجائے اور خود تو اقامت دین کی جدوجہد سے جی چراتا ہی ہو، اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

اقامت دین کے اصول و مناہج

جب یہ بات واضح ہوچکی کہ ہماری زندگی کا نصب العین بہرحال اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس گول کی طرف بڑھ سکتے ہیں؟ سو جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، ان کے لیے یہ معلوم کرلینا چنداں دشوار نہیں کہ ہر جماعت کا جو کسی خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی تاسیس، تعمیر اور تنظیم کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اس طریق فکر، اس زاویۂ نگاہ، اور اس انداز تعمیر کی تعیین وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک نیشنل اسٹیٹ قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے مخاطبین کے دلوں کو وطن اور قوم کے عشق اور احترام سے معمور کریں، اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی ناموس کی قربان گاہ پر نثار ہوجانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کے جذبات پیدا کریں۔ جب یہ سب آپ کرلیں گے اور اس طرح کے آدمی آپ کے اردگرد جمع ہوجائیں گے تو سمجھیے کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کرلیں۔ آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق اور قیامت و جزائے عمل کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے اندر مذہب کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے احسان و تقویٰ، عدل و انصاف، رحم و مروت، عفت و پاکدامنی، جود و سخاوت وغیرہ اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کرلیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کو دیکھنے کی حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں، بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں، یہاں تو جو شے مطلوب ہے وہ صرف حریف کی غیر مشروط عداوت و مخالفت اور قوم، قومی اقتدار، قومی وقار اور قومی عروج کی انتہائی شیفتگی اور فداکاری ہے۔

اسی طرح اگر آپ ایک ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی خوبیاں اتارنی ہوں گی، سرمایہ داری کے

خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہلِ مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے، اور خدا، رسول، مذہب، آخرت، اخلاق اور اعمالِ صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کے اور ان کے نقوشِ ارادت کو ذہنوں سے مٹا کر، خالص مادی تصورِ حیات اور حیوانی تصورِ کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں گے اور یہ خیالات اور نظریات ایک معقول تعداد میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیں گے تو ان سب کو ایک جتھے میں منسلک کر کے ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ، تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظامِ حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں گے تاکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقہ پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور سفاک طبیعت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ پھر اپنے مقصد کے مطابق لوگوں کو جب وہ حاصل کرے گا تو ان صفاتِ مطلوبہ کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انھیں گُر سکھائے گا، اسلحے مہیا کرے گا تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر بامقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیشِ نظر مقصد سے قلبی لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریقِ کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ پھر "امتِ مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیامِ دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریقِ کار ہونا چاہیے۔ آیئے دیکھیں وہ طریقِ کار کیا ہے؟

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو فطرۃً وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھیرتی ہے۔ اور جب واپس لوٹتی ہے تو طمانیت کی دولت لے کر لوٹتی ہے۔ جس طرح قرآن اور صاحبِ قرآن نے اقامتِ دین کے نصب العین کو پوری تشریح اور وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، اسی طرح اس کے طریقِ کار کے بارے میں بھی کسی حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا ہے، بلکہ ایک واضح جیتا جاگتا طریقہ قرآن و سنت کے صفحوں میں اسی طرح نمایاں نظر آتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینہ پر کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے لانے والے اور قرآن کے بھیجنے والے تینوں نے اس طریقِ کار کی طرف رہنمائی کی ہے، جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیرِ بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔

قرآنی اصول و نکات

قرآن کو غور سے پڑھیے اور اس کی تمام تعلیمات کو بخوبی طور پر سامنے رکھیے تو بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ وہ اصول و نکات ہاتھ آجاتے ہیں جن پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ اور یہی اصول و نکات دراصل تعلیماتِ قرآن کا متن ہیں یعنی اور درحقیقت سارے قرآن کی بحث کا مرکز یہی ایک مقصد ــــ مقصدِ اقامتِ دین ــــ ہے اور اس کی ساری تفصیلات اسی مقصد کے اصول کی شرح ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو اجاگر اور اس متن کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کے چشمۂ حیوان کو اچھی طرح کھنگالنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے کافی وقت درکار ہے، اس لیے ہم اس موقع پر قرآن کی صرف ان آیتوں کی طرف توجہ دلائیں گے جو مسلسل ایک ہی رکوع میں درج ہیں اور ہمارے بحث کے لحاظ سے گویا پورے قرآن کا خلاصہ ہیں یعنی اقامتِ دین کے جو اصول و نکات

قرآن کے سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیے گئے ہیں وہ یہاں چند سطروں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصولوں ہی کی وضاحت کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ان اصولوں کی ترتیب اور اس نصب العین کے فطری ارتقا کے تدریجی ادوار و منازل کی نشاندہی بھی کرتی ہیں، اس لیے ان آیتوں کو ایک بار ترتیب کے ساتھ پڑھ لیجیے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ...... وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ...

(آل عمران ۱۰۲)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے...... اور چاہیے کہ تم ؐ گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔ اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔

ان آیات کا زمانۂ نزول مدینہ کی ابتدائی زندگی یعنی ۲ھ یا ۳ھ ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی۔ عین اس زمانہ میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں، اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو بالترتیب اس کے حسب ذیل تین اجزا یا تین نکات نظر آتے ہیں:

(۱) التزام تقویٰ (۲) اعتصام بحبل اللہ (۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان نکات سہ گانہ کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے:-

(۱) التزام تقویٰ

پہلی چیز جو اقامت دین کے سلسلہ میں مطلوب ہے، اور جس کو اس قصر کا سنگ بنیاد کہنا چاہیے اِتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ہے۔ یعنی ہر وہ فرد جو ایمان کا مدعی ہو اور جو اس فرض کو ادا کر کے اپنے سر سے بندگی کا ذمہ اتارنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور تادم واپسیں، ہر آن اور ہر لمحہ، ایک "مسلم" کی طرح زندگی بسر کرے تقویٰ کا مفہوم، جو قرآن نے متعین کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس نے جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اس کے کسی امر کی عدم تعمیل سے بھی ڈرا جائے اور کسی نہی کے ارتکاب سے بھی خوف کھایا جائے۔ اور مسلم کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت کیش کے، یعنی وہ شخص جس نے اوامر الٰہی کے سامنے رضاکارانہ اپنی گردن جھکا دی ہو۔ تو گویا اقامت دین کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے، خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے اور تسلیم و تعظیم اور تذلل و تواضع کے تمام جذبات اسی کی رضاجوئی میں نثار کر دے، تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

اپنے نفس کو ان تمام رذائل سے پاک کرے جو ناخوشنودی رب کے موجب بنتے ہیں اور ان تمام محاسن سے آراستہ کرے جو رضائے الٰہی کے باعث ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تو لیت ولعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو رضائے حق اور امتثال امر رب پر پوری طرح جمائے خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں کہ دراصل یہ چیزیں مشکلات و مصائب نہیں ہیں بلکہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی وہ امتحان گاہیں ہیں جن سے گذرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان و اتقا خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل کرتا جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الخ

(بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال وجان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ آزمائیں گے۔ اور اے نبی! اُن لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو جو ان خطرات ونقصانات کو صبر وضبط کے ساتھ برداشت کر لیں۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ

(عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا؟ حالانکہ (یہ آزمائش ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے۔ سو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

پس ان چیزوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان عوائق کے آگے سپر ڈال دے اور سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ بڑے دھوکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے اور اتباع حق کو جان ومال کی کامل حفاظت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل وصورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں بن سکتا۔ غرض ابتلائے مومنین اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے، اور اسی سنت کو پوری کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) اتحاد وتنظیم اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان جو اپنی انفرادی اصلاح وتزکیہ میں کوشاں اور احکام الٰہی وحدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں۔ اور ان کو باہم جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو، نہ کوئی وطنی مفاد، نہ کوئی معاشی وسیاسی غرض ہو، نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد، بلکہ صرف اللہ کی "رسی" یعنی وہ کتاب ہو جس کو قرآن کہا جاتا ہے، وہ شریعت ہو جس کی پیروی کا ہر مومن نے عہد کیا ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت واقامت کے لیے بندگان خدا کی آفرینش ہوئی ہے۔ پس یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب ومحبوب شے ہے۔ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کو مطلوب نہیں بلکہ اس کی نظروں میں وہ صد درجہ مردود ومبغوض ہے اور

اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد و ائتلاف کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامت حق ہو۔

اقامت دین کا یہ نکتہ یعنی اتحاد امت، اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور متغایر شے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت مجبور کرتی ہے کہ اپنے رفقائے درس سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک صاحب علم کی فطرت چاہتی ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف کھنچ اٹھنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی طالب علم کو اپنے رفقا سے، کسی صاحب علم کو علما و افاضل سے، کسی رنگین مزاج کو اپنے ہم مشربوں سے کوئی گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم، صاحب علم اور رنگین طبع نہیں ہے۔ یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہ جنسیت کہا جاتا ہے اور یہی جاذبہ جنسیت اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرتا ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی اور اتباع احکام قرآنی کے جذبات سے سرشار ہو، لازمی طور پر ان لوگوں کی طرف کھنچے گا جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو لیکن وہ آپس میں کٹے ہوئے ہوں، ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے۔ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی راز ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے الفاظ سے کی گئی ہے، اور کہیں رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ان کی علامت فارقہ بتلائی گئی ہے، کہیں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشان امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے مدعیوں اور پیرووں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ پھر دوسری طرف اس رنگ وحدت کو برقرار اور شوخ سے شوخ تر کرنے کے لیے منفی پہلو سے بھی اس پر روشنی ڈال دی گئی ہے اور تصریح کے ساتھ تمام اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (توبہ-۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی نہ بناؤ اور جو ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی، دیگر اتقیا اور صالحین سے بُعد اور کشیدگی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے رابطہ قلبی بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے یگانے ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس امکان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (مجادلہ-۳)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ان لوگوں سے الفت و محبت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں، خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

غرض ایک اصول اور نصب العین کی علمبردار پارٹی جس طرح اپنے ارکان کو ڈسپلن کی سخت بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہے

اسی طرح قرآن نے مداہنت کے تمام رشتوں کو کاٹ کر ایک مرکز سے جڑ جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ یہی بات اس نے اتحاد و اتفاق کی فہمائش کے ساتھ بھی واضح کر دی ہے اور کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ خبردار ان بدبخت لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جو "بینات" الٰہی کے انوار رکھتے ہوئے بھی افتراق و تشتت کی تاریکیوں میں کھو گئے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری دفعہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کے ارشاد الٰہی میں واضح کی گئی ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنی ذات کے اوپر دین حق قائم کرنے اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بننے کے ساتھ ساتھ اس "خیر و معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس منکر کو حسب استطاعت اور حسب مواقع کہیں بزور شمشیر کہیں بذریعہ زبان، اور کہیں بواسطۂ استکراہ قلب، مٹا ڈالنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے، یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اثر و اقتدار باقی نہ رہ جائے۔ جس طرح اقامت دین کی دوسری دفعہ یعنی افراد امت کا اجتماع و اتحاد، پہلی دفعہ یعنی انفرادی صلاح و تقویٰ کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اس کا عین مقتضائے فطرت ہے۔ نہ کوئی خارجی اور غیر متعلق اور مختلف المزاج حکم۔ محبت کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ گرد و پیش انہی احوال و مناظر کی کارفرمائی ہو جو محبوب کو پسند خاطر ہوں، وہ دل سوز محبت سے آشنا نہیں کہا جا سکتا جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھے اور دیکھ کر سیماب وار تڑپ نہ اٹھے۔ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت، کہ روح تقویٰ عبارت ہے انہی چیزوں سے۔ ایک خدا پرست اور "متقی و مسلم" کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور ایک منکر بھی موجود ہو۔ اس کے اسلام اور ایمان کے یہ شے منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین الٰہی کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرے۔ پس اقامت دین کا فرض ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ پیروان دین حنیف کی جمعیت امر بالمعروف کے فرض کو سر انجام نہ دے رہی ہو۔ اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ کی منزل طے نہیں ہو سکتی اگر اہل ایمان خود اتباع احکام الٰہی کرنے ہی پر اکتفا کر لیں اور ان کو اس سے کوئی بحث نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس اقتضائے ایمانی کے علاوہ امر بالمعروف کی ایک خالص سیاسی ضرورت بھی ہے۔ فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف جارحانہ پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست لشکر بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتا اگر وہ دشمن کے خلاف جارحانہ حملے کرنا نہ جانتا ہو۔ کوئی تحریک زوال و انحطاط کے انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ اپنی داخلی تعمیر و تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اسی طرح وہ جماعت جو اللہ کے دین کی علمبردار ہو، اس وقت تک زندگی اور پائندگی کی حق نہیں ہو سکتی نہ ہی اس کے اپنے اوپر دین کا قیام باقی اور مستحکم رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہاتھوں سے طاغوتی مورچوں پر مسلسل جارحانہ حملے نہ کرتی رہے۔

جس طرح ایک جاندار کا جسم محنت و مشقت کے بعد اپنے بعض اجزا کے تحلیل ہو جانے کی وجہ سے کمزور ہوتا رہتا ہے اور اس کمزوری

کو دور کرنے اور اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جسم کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں اسی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی جماعت کی قوت خیر و تقویٰ کو بقا و استحکام اور مزید نشو و نما دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رگوں میں امر بالمعروف کے ذریعہ خدا پرستی کا خون تازہ بتازہ داخل کیا جاتا رہے، ورنہ رفتہ رفتہ اس میں روح تقویٰ مضمحل ہوتی جائے گی اور خود اس کے اوپر سے دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کائنات طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، سکون و جمود سے اس کی فطرت ناآشنا ہے، اگر اس کو آگے کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو یقیناً پیچھے ہٹنے لگے گی، کوئی شے کسی ایک حالت پر تھم کر نہیں رہ سکتی، ضرور ہے کہ شئی کسی سمت حرکت کرتی رہے اس لیے قیام دین کی تحریک اگر آگے نہ بڑھے گی تو پیچھے ہٹنا شروع کر دے گی۔ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا "آج تک ہمارا دین ترقی کے زینے طے کرتا رہا لیکن اب جب کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ گیا ہے، اس کے انحطاط کا آغاز ہوگا، کیونکہ جو شے بھی کامل ہو جاتی ہے وہ ناقص ہو کر رہتی ہے"، آنحضرت صلعم نے فرمایا "بیشک تم نے بہت صحیح بات کہی"۔ پس نہ صرف اس لیے کہ فریضۂ اقامت دین کا امر بالمعروف ایک لازمی عنصر ہے، بلکہ اس لیے بھی، کہ یہی امر بالمعروف اسلامی جماعت کے جوہر ایمان و اتقا کا محافظ ہے، اس کو اس فرض کی ادائگی سے کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ قرآن مجید نے اقامت دین کے یہ تین نکات پیش کیے ہیں اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں نکات پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں کوئی اس قسم کی زمانی ترتیب ہے کہ جب پہلے نکتہ پر کامل طور سے عمل ہو لے تب دوسرے کی بسم اللہ کی جائے اور جب دوسرے کا کمال اتباع معرض وجود میں آئے تو تیسرے کو سامنے لایا جائے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نکات پر بیک وقت عمل شروع ہو جانا چاہیے اور اس سے پہلے اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف ایک چیز کی ہے یعنی ذہن کی پوری یکسوئی اور قلب کی سچی شہادت کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پر ایمان لانا۔ اس اقرار و اعتراف کے بعد جب ایک شخص يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے زمرۂ مخاطبین میں آ گیا تو قرآن بیک وقت اس کے سامنے یہ تینوں مطالبے رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان تینوں نکات پر ایک ساتھ عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ ان تینوں نکات میں عمل کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں اور حقیقت تو یوں ہے کہ دوسرے اور تیسرے نکتے بھی پہلے ہی نکتہ کے اجزا یا یوں کہیے کہ اسی کے تکملات ہیں نہ کہ اس سے علیحدہ مستقل بالذات نکتے۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتہ کے اتباع کی تکمیل ہے اور جب تک ان دونوں پر عمل نہ ہو لے، پہلے پر عمل کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی کل کے تمام اجزا موجود نہ ہو لیں وہ کل اپنی کامل شکل میں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس دعویٰ کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی بڑی بحث و تحیص کی ضرورت نہیں بجز اس کے کہ تقویٰ کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ تقویٰ ان تمام حدود کی ٹھیک ٹھیک پابندی کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے میدان زندگی کے ہر چہار اطراف میں قائم کر دی ہیں اور آدمی اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں ——— خواہ ان کا تعلق براہ راست اپنے نفس اور اپنی انفرادی زندگی سے ہو، خواہ منزلی اور معاشرتی

زندگی سے، خواہ سیاسی اور اجتماعی زندگی سے ـــــ غرض ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کا اتباع اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس امر سے انکار کرنا کہ اقامتِ دین کے باقی دو نکات دراصل پہلے ہی نکتہ کے مقتضیات اور تکملات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کوئی دو دونی کے چار ہونے سے انکار کردے۔ کیونکہ اپنے نصب العین زندگی کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد رہنا اور امر بالمعروف میں اشتغال دائمی رکھنا بھی تو منجملہ انہی احکام وحدود کے ہے جن کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیے:۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ - ۱۵)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات - ۱)

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف وعناد پیدا ہونے کی صورت میں) صلح کرادو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) ...... وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم - ۴)

...... اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر کوئی اپنے اپنے خیالات وافکار میں مست ہے۔

ان میں سے پہلی آیت میں سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری میں دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسری آیت میں اس رشتۂ اخوت ویگانگت کے فقدان کو بالکل شرک کا مظہر قرار دے کر اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی دور کردیا گیا ہے کہ ایمان وتقویٰ کے تحقق کے لیے جماعتی اتحاد ومرکزیت شرط لازم ہے۔ اس اصلِ دینی کی پوری وضاحت اور اہمیت دیکھنی ہو تو ان آیات کے ساتھ ان احادیث کو بھی سامنے رکھ لینا چاہیے جن میں جماعت کے لزوم پر کفر وایمان تک کا فیصلہ کردیا گیا ہے اور صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ اس جماعت مومنین سے، جو "الجماعت" ہے اور جو صحیح معنوں میں دین حق کی علمبردار اور رسول کے مشن کی حامل اور اصحاب رسول کے نقوش قدم کی پیرو ہے، الگ ہونے والا دائرۂ اسلام سے خارج، اس کی زندگی کا فرانہ، اس کی موت جاہلیت کی موت اور اس کا انجام آگ کا انجام ہے۔

اس کے بعد چند دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں امر بالمعروف کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:۔

...... يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ...... وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (آل عمران - ۱۲)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں .... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱۶)

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر درشتی محسوس کریں، یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صفات متقین اور اوامر تقویٰ میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل یعنی قتال کفار کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے دونوں چیزوں کو اجزائے ایمان کے تحت ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے اور باہم جڑ کر ایک منظم پارٹی کی طرح رہنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا مومنین کا نشان امتیاز اور مقتضائے ایمان قرار دیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نور تقویٰ سے بخوبی منور نہ ہولے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکات کی طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں۔ دراصل یہ وہم ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر پڑا ہوا ہے جس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا ہی جاذب نظر اور روحانیت نواز دکھائی دیتا ہے مگر اس کا باطن اوہام باطلہ اور فریب جہل سے یکسر مملو ہے۔ جب ایک شخص متقی اسی وقت ہو ہی سکتا ہے جب وہ دیگر اہل ایمان سے اتحاد و ولایت کا رشتہ جوڑ لے اور بقدر امکان امر بالمعروف کے فرائض سرانجام دیتا رہے تو یہ بات کتنی لایعنی ہوگی کہ آدمی پہلے متقی کامل بن لے تو "اعتصام بحبل اللہ جمیعاً" اور "امر بالمعروف" کی مہم کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء کی سی ہے۔ جس طرح بیج سے ننھا سا پودا اگتے ہی اس میں جڑ، تنہ اور پتے کی تخلیق ہو جاتی ہے اور تینوں ایک ساتھ نشوونما حاصل کرتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہولے تب اس میں سے تنہ نکلے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ لے تو اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں، یہی تخم ایمان سے پھوٹنے ہوئے شجر اسلام کا حال بھی ہے۔ طہارت نفس یعنی انفرادی تقویٰ کو اس شجرہ مبارکہ کی جڑ اور اتحاد و ائتلاف کو اس کا تنہ اور امر بالمعروف کو اس کی پتیاں سمجھنا چاہیے۔ زندہ جڑ کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں۔ اسی طرح نفس انسانی میں طہارت اور روح تقویٰ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ اس میں سے اتحاد امت اور امر بالمعروف کی مساعی کا ظہور ہو۔

قرآن کے طریقۂ نزول سے رہنمائی

اقامت دین کا یہی فطری طریقہ کار ہے، اور یہی وہ اصول نکات ہیں جو قرآن حکیم کی ترتیب نزول سے بھی مستنبط ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف دو چیزوں کی تعلیم تھی، ایک تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت وغیرہ کی تعلیم دوسری اقامت صلوٰۃ اور محاسن اخلاق کی تعلیم۔ جس طرح ایک کسان اپنی زمین میں مہینوں ہل چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بیج کو روئیدگی بخشنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ جو بیج بھی اس میں ڈالتا ہے، فوراً اگ آتا ہے، اسی طرح تیرہ برس کی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صرف ایمان کی، اور ذکر و نماز اور اسی طرح کے چند بنیادی امور کی تعلیم و تلقین کرتا رہا۔ چنانچہ بالکل ابتدائی سورتوں مثلاً سورہ مزمل سورہ مدثر وغیرہ کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بار عظیم کے اٹھانے کے لیے، جو پیغمبر اور اس کے حواریوں پر ڈالا جانے والا تھا، کس طرح ایمان کو دلوں میں اتارنے کے ساتھ ساتھ نماز اور ذکر الٰہی، صبر اور توکل اور انابت و خشیت کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ دل اس بوجھ کو سہارنے کے لیے تیار ہو جائیں جو آگے چل کر ان پر پڑنے والا ہے اور طاعت و انقیاد کے لیے اس حد تک آمادہ ہو جائیں کہ جس وقت جو حکم بھی اوپر سے آئے بلا چون و چرا اس کی تعمیل کے لیے اپنی جان و مال حاضر کر دیں۔ اور شہادت و اقامت دین حق کا جو فرض ان پر عائد کیا جانے والا تھا اس کو ادا کرنے کے لیے مستعد

ہوجائیں جب انفرادی حیثیت سے یہ تزکیہ قابل اطمینان حد تک پہنچ چکا تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدود و احکام کا نزول شروع ہوا اور وہ سورتیں نازل ہونے لگیں جن میں ایک منظم پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں کو سامنے رکھ کر ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس ضمن میں وہ احکام بھی آئے جو تمام اہل ایمان کو ایک جماعت بن کر رہنے کی ہدایت پر مشتمل تھے اور وہ احکام بھی جو ایک جماعت کی تطہیر و تمحیص کی ہدایات سے متعلق تھے۔ مدنی سورتوں کو پڑھیے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ پھر امر بالمعروف کا حکم بھی حالات کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ نازل ہوتا رہا۔ مکی زندگی میں یہ حکم زبانی تبلیغ و ارشاد تک محدود رہا۔ مدینہ میں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے کام لینے کی بھی تاکید کی گئی لیکن ایک عرصہ تک حالات کے لحاظ سے یہ کام صرف مدافعت کی حد تک محدود رہا۔ پھر فتح مکہ کے بعد جب عرب میں کفر نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں کو اطمینان اور بے خوفی کی فضا میسر ہوئی اور وہ ایک بالادست قوت کی حیثیت میں ہوگئے، تو تمام کفار و مشرکین سے برات کا اعلان کر کے دفاع، اقدام سے بدل دیا گیا اور وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ فرما کر اس وقت تک کے لیے اہل ایمان کو امر بالمعروف یعنی حق کی اشاعت اور اقامت کا ذمہ دار بنا دیا گیا جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے اور اس میں حق سے باطل، معروف سے منکر، ایمان سے کفر اور دین الٰہی سے دین طاغوت حریفانہ برد آزمائی کے لیے موجود ہے۔

اسوۂ رسول اقامت دین کا یہ طریق کار اور یہ اصولی نتائج تو ہمیں قرآن سے حاصل ہوتے ہیں، اب اگر آپ معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہی اصولی نکات جو قرآن کے اندر الفاظ کے جامہ میں تھے، یہاں واقعات اور تجربات کی شکل میں موجود ہیں۔ اور نبی اکرمؐ نے ٹھیک انہی لائنوں پر امت مسلمہ کی تاسیس اور تربیت و تنظیم کی۔ سب سے پہلے تو آپ نے عرب کے اس کفر زار میں، جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، ایک آواز بلند کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام جذبات و میلانات اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس ذات واحد کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندہ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس حقیقت کو دوسروں پر برابر کھولتا رہا جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور نظریۂ زندگی میں تن تنہا تھا اس نے ایک لحظہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عقیدہ اور نظریہ کو چھپائے رکھے اگرچہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور ان لوگوں میں سے، جن کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں، ایک ایک دو دو کر کے آپ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے قلوب و اذہان میں ایک خدا کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ رضا صرف اس کی چاہو جس نے تمہیں زندگی اور سامان زندگی عطا کیا اور حکم صرف اس کا مانو جس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز و درماندہ ہیں۔ یہ نقش بٹھانے کے بعد ان کو زندگی کے احوال و مسائل میں بتدریج وہ احکام سنانے شروع کیے جو احکم الحاکمین کی طرف سے آپ پر نازل ہوتے رہے اور ہر حکم پر خود عمل کرتے ہوئے ان کو اس پر عمل کرنے کی تعلیم دی، جاہلیت کی کثافتوں سے ان کے باطن پاک کر کے ان میں مکارم اخلاق کی تخم ریزی کی اور اپنی بے مثال قوت تربیت سے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا عقیدت کیش بنایا کہ اعدائے توحید نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کے نشہ سے خالی نہ کر سکے۔ اس تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ آپ ان سب لوگوں کو، جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے، ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جوڑنا اتنا پائیدار تھا کہ

بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ پھر اسی کے ساتھ توحید کی دعوت و تبلیغ نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ اس کا دائرہ گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر اور شہر سے اطراف ملک تک وسیع ہوتا گیا۔ آنحضرت صلعم بھی اور آپ کے اتباع بھی سب کے سب دعوت حق کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ دم مصروف رہتے اور جس کسی کو شرک و کفر کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، دوسرے لفظوں میں ایک خدا کا غلام اور ایک حاکم علی الاطلاق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے، جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کی تدبیر کرتے، اور کفر و فسق کے جس طوفان سے رحمت حق نے انھیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ یہ جد و جہد تیرہ برس تک مکہ میں جاری رہی، پھر وہ وقت آیا جب دشمنان حق کے لیے اس دعوت توحید کی مقبولیت اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کا انتظام کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا تو داعی حق اور اس کے پیروان صفاکیش نے مکہ کو خیرباد کہہ کر مدینہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا اور وہاں سے اس نصب العین کی خاطر جد و جہد شروع کر دی جس کو وہ اپنا مقصد زندگی بنا چکے تھے، اور جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو بدی کے استیصال اور حق و عدل کی بقا کے لیے تلوار اٹھائی گئی۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور مسلمان صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ خوف، دہشت، بے اطمینانی اور طرح طرح کے خطرات برداشت کرتے رہے اور جان و مال کی ہر ممکن قربانی کر کے حق کی شہادت دیتے رہے، یہاں تک کہ حدود عرب میں کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا اس وقت مسلمانوں کا قلب اس تائید و نصرت الٰہی پر شکر و امتنان کے جذبات سے بھر تو گیا مگر ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے اور ان کی تلواریں اسی طرح کھنچی رہیں۔ ان کے ہاتھ، جو اب تک دفاع کے لیے اٹھ رہے تھے، اب جارحانہ اقدام کے لیے سرگرم کار ہو گئے کیونکہ گو عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر چہار طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس مشن کو بھول نہیں سکتے تھے کہ منکرات کو مٹا دینا چاہیے، جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر غیر اللہ کی آقائی پامال ہو جانی چاہیے، خواہ وہ کسی گوشہ ارض پر ہو، یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے۔ اسی کے قانون کا اتباع ہونا چاہیے۔ اسی کی مرضی پوری ہونی چاہیے، اور اس "چاہیے" کی کل ذمہ داری میرے سر ہے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری انھوں نے پورے احساس فرض کے ساتھ ادا کی، اور جب تک وہ ایسا کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی موعودہ تائید و نصرت ان کے ہم رکاب رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے باندھا ہوا عہد اقامت دین فراموش ہونا شروع ہوا اور دین حق کا چڑھتا ہوا سورج مسلمانوں کی قسمت کا ماتم کرتا ہوا زوال پذیر ہونے لگا۔ اور اب دوبارہ بام عروج پر آنے کے لیے اس مبارک صبح کا منتظر ہے جس میں حاملین قرآن عہد فراموشی کے خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے فرض منصبی کو از سر نو سنبھال لیں گے۔

رسائل و مسائل

جذباتی اور غیر حکیمانہ طرزِ تبلیغ

سوال: میں نے ایک طالب علم کو جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دی اور زبانی طور پر بھی میں اس کو جماعت کے نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کرنے کا تہیہ کرچکا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کا ماحول بھی اس کا دشمن ہو رہا ہے اور وہ بھی اس سے سخت بیزار ہے۔ اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر ہجرت کرکے دار الاسلام چلا جائے۔ اس کی والدہ بعض شرائط پر راضی ہوگئی ہیں مگر والد سے اجازت ملنے کی کوئی توقع نہیں، اس لیے اس نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ "کیا والدین کی اجازت اور مرضی کے علی الرغم دار الاسلام ہجرت کرجاؤں"؟ میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ "مکہ سے مدینہ جانے کے قبل تمام مہاجرین نے اپنے والدین سے اجازت نہیں مانگی تھی"۔ اس کا دوسرا استفسار یہ تھا کہ "کیا جماعت میری پشت پناہی پر آمادہ ہوگی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں برے سلوک اور مصائب سے دوچار ہوں"۔ اس کے جواب میں میں نے اس کو لکھ دیا ہے کہ "گو اس کے متعلق صاف صاف کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ نظامِ باطل کے تحت ہزاروں روپیہ کی کمائی اور ساری دنیوی لذتیں، نظامِ حق کی جد و جہد کی خاطر فقر و فاقہ کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، رسول عربی کا اسوہ، جس کے اتباع کا ہم مسلمان دم بھرتے ہیں، ہم کو یہی بتاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ جماعت ہمیشہ اور ہر وقت ایسے لوگوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہے جو نظامِ باطل سے بھاگ کر نظامِ حق کی طرف آ رہے ہوں، بلکہ وہ ایسے لوگوں کا خیر مقدم کرے گی بشرطیکہ وہ صرف حق پرست اور حق طلب ہوکر جا رہے ہوں"۔

اب ان امور کے متعلق براہ راست آپ کی ہدایتیں مطلوب ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آگئی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں ایک مدرسہ میں معلم ہوں۔ جب میری ان تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع حکومت کے محکمۂ تعلیمات کو ملی تو اس نے مجھ سے چند سوالات کیے، جن میں مجھ سے جماعت کی حیثیت، اس کے مقاصد، امیرِ جماعت کی شخصیت وغیرہ امور کی بابت استفسار کرتے ہوئے یہ جواب طلب کیا گیا ہے کہ تم ایک فرقہ وار جماعت کے رکن کیوں ہو اور فلاں طالب علم کو کیوں اس بات پر ورغلاتے ہو کہ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو ترک کرکے خلاف مرضی والدین دیگر ممالک کو ہجرت کر جائے... وغیرہ۔ فرمائیے اس مراسلہ کا کیا جواب دوں؟ میرا اپنا ارادہ تو صاف صاف اظہارِ حق کا ہے۔

جواب: آپ نے یہ غلطی کی کہ لوگوں کو تبلیغ کی تیز تیز خوراکیں دے کر ہجرت اور ترکِ علائق پر آمادہ کرنا شروع کردیا حالانکہ میں صحیح پوزیشن کئی مرتبہ واضح کرچکا ہوں۔ ہم ابھی تک اُس مرحلہ میں نہیں پہنچے ہیں جبکہ مختلف مقامات سے اپنے سب ہم خیالوں کو ایک جگہ سمٹ آنے کی دعوت دے سکیں۔ نہ ہمارے پاس جگہ ہے، نہ ذرائع ہیں، نہ صحیح معنوں میں ایسا کوئی دار الاسلام بن گیا ہے جس کی

طرف دار الکفر سے ہجرت کرنا ضروری ہو، ورنہ اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ "مکی زندگی" کی بھٹی سے اچھی طرح گذرے بغیر لوگ مجرد عقیدہ و نصب العین قبول کرکے کسی ایک مقام پر جمع ہونے لگیں، کیونکہ اس طرح وہ مضبوط سیرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی جو ایک کافی مدت تک مخالف ماحول میں کشمکش کرنے اور استقامت دکھانے سے بنا کرتی ہے۔ لہذا اس وقت لوگوں کو ہجرت کی دعوت دینا ہمارے کام کے لیے اصولاً غلط بھی ہے اور بےحد نقصان دہ بھی، اور اس پالیسی کے بھی خلاف ہے جس پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنے مرکز کو ذرائع کی کمی اور مشکلات کے ساتھ بتدریج مضبوط بنا رہے ہیں اور اس مرحلہ پر صرف ان لوگوں کو بلا رہے ہیں جن کی فی الواقع ہم کو ضرورت ہے۔ اس تدریجی نقشے کے خلاف ایک زائد آدمی کا آجانا بھی ہماری مشکلات میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ پھر ہماری کوشش یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ہم صرف آزمودہ آدمیوں ہی کو بلائیں جن کے متعلق ہمیں پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ ساری اسکیموں میں ٹھیک ٹھیک مددگار ہو سکتے ہیں۔ ناآزمودہ آدمیوں کے بلا انتخاب جمع ہو جانے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے اشخاص کے اجتماع سے کام میں مدد ملنے کے بجائے الٹی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جب تک میں اپنے نقشہ کے مطابق ایک صحیح و مستحکم ماحول پیدا نہ کر لوں جس پر مجھے یہ اطمینان ہو کہ اب جو اس ماحول میں آئے گا وہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلتا چلا جائے گا اس وقت تک میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ غیر معلوم الحال اصحاب بطور خود مرکز میں آکر رہنا شروع کر دیں۔ سردست جو لوگ مرکز میں آنے کے امیدوار ہوں ان کو ایک کافی مدت تک اپنے ماحول میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کرکے مخالفتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھا کر اپنی اس قابلیت کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ مرکز میں بلائے جانے کے لائق ہیں۔ اب اخلاقی جرأت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود ان نوجوان دوست کو لکھیں کہ آپ نے جو ان کو ہجرت کرنے کی ترغیب دی تھی وہ آپ کی غلطی تھی اور آپ سے یہ غلطی جماعتی پالیسی کے خلاف سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ آپ انھیں تلقین کیجیے کہ وہ ایک طرف اپنی دینی معلومات کو ضروری حد تک مکمل کرنے کی کوشش کریں، اور دوسری طرف ہماری جماعت کے نام پر کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے لٹریچر کو اچھی طرح پڑھ کر ہمارے مسلک اور طریق کار کو سمجھ لیں پھر اس کے مطابق اپنے ماحول میں ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عزیز موصوف کو ان کے والد کے علی الرغم ہجرت کرنے کی رائے دی۔ اول تو مکہ میں مشرک و کافر ماں باپ کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا وہ بعینہ ان مسلمان ماں باپ کے معاملہ میں اختیار کرنا درست نہیں ہے جو ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی غفلت و ضلالت میں مبتلا ہوں مگر بہرحال ہیں مسلمان۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلہ پر والدین کی اجازت کے بغیر، بلکہ ان کے حکم کے خلاف کوئی اقدام کرنا اولاد کے لیے جائز ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ امیر جماعت تمام شرعی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایسا کرنے کا حکم دے۔ ایسے باضابطہ حکم کے بغیر کسی شخص کا بطور خود یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ وقت والدین کی نافرمانی کر گذرنے کا ہے کسی طرح صحیح نہیں۔

عزیز موصوف کا جو خط براہ راست میرے پاس آیا ہے اس کو دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جماعت کو، اس کے نظام کو، اور اس کے طریق کار کو بالکل نہیں سمجھے ہیں اور ان کے ذہن میں جماعت کی پوزیشن کا کچھ عجیب تصور قائم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید اس جماعت نے اپنا کوئی اسٹیٹ قائم کر لیا ہے، اور وہ اسٹیٹ بھی بڑا دولت مند ہے۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ انھیں یہاں آنے کے مصارف ہم بھیجیں گے، یہاں ان کی ضروریات کی کفالت بھی ہم ہی کریں گے، اور ان کو سال میں دو مرتبہ گھر بھی ہم اپنے ہی

خرچ پر بھیجتے رہا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور کو لیے ہوئے اگر وہ دار الاسلام آنے پر آمادہ نہ ہوتے تو اور کیا کرتے۔ اور اگر ہماری دعوت ایسی ہی فیاضانہ ہو تو نیک نیت اہل ایمان میں سے کس کو اپنی نوکری چھوڑ دینے یا مدرسے سے نکل آنے میں تامل ہو سکتا ہے؟ ان کی اس بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کا طرز تبلیغ بہت خام ہے۔ جس میں فہم کا عنصر کم اور جذباتی جوش کا عنصر زیادہ ہے، اسی وجہ سے ایسے لوگ جو ہمارے مسلک و طریق کار کو پانچ فی صدی بھی نہیں سمجھے ہیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے ساتھ آملنے کو بچانوے فیصدی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ براہ کرم اس طرز تبلیغ کی اصلاح کیجیے ورنہ جو پیچیدگی ان عزیز کے معاملہ میں پیش آئی ہے اس سے زیادہ آئندہ پیش آنے کا خطرہ ہے۔

یہ بات بھی میں اس سے پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب تک آپ سرکاری ملازمت میں ہیں قواعد ملازمت کے اندر رہتے ہوئے کام کیجیے۔ اول تو کسی سے تنخواہ لینے کے بعد ان شرائط کی پابندی نہ کرنا جن کے تحت وہ تنخواہ دے رہا ہے اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ قواعد کے خلاف کام کریں گے اور اس کی پاداش میں برطرفی یا کسی اور قسم کی سزا پائیں گے تو اس سے آپ کی اخلاقی پوزیشن الٹی کمزور ہو جائے گی، حالانکہ اس وقت نظام جاہلیت کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اسلحۂ جنگ اگر کوئی ہے تو وہ اخلاق ہی ہے۔ اس لیے آپ نے طالب علم مذکور کو جس طرز کی تبلیغ کی اور اس کی وجہ سے جو باز پرس آپ سے ہوئی وہ ان ہدایات کے خلاف ہیں جو آپ کو مرکز سے دی گئی تھیں۔ اب آپ کو ان سوالات کے جواب میں، جو آپ سے کیے گئے ہیں، بالکل سیدھے اور صاف طریقہ سے صحیح صحیح بیان دینا چاہیے۔ لیکن جواب آپ کا سخت نہ ہونا چاہیے۔ زبان اور لب و لہجہ میں پوری معقولیت ہو۔ جو غلطی ہے اس کو غلطی تسلیم کر لیجیے، اور آپ کی اور اس جماعت کی جو صحیح پوزیشن ہے اس کو بے تکلف بیان کر دیجیے۔

ہمارے طریق کار پر چند اعتراضات اور انکا جواب

سوال:۔ آپ کے طریق کار میں ہم کو چند بنیادی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کو نیچے درج کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ان کے متعلق اپنے خیال کی وضاحت فرمائیں گے۔

(۱) آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کا طریق تبلیغ وہی ہے جو انبیائے کرام کا تھا۔ مگر ہر نبی پہلے خالص توحید کی دعوت دیتا تھا اور ایک ایک الٰہ باطل کا نام لے کر اس کی پرستش سے لوگوں کو منع کرتا تھا۔ لیکن آپ ان باطل الہوں کا ذکر ضمناً کرتے ہیں، اصل مقصد تبلیغ اسے قرار نہیں دیتے۔ کیا کسی نبی نے مصلحتاً اس کام کو موخر کیا تھا اور پہلے صرف ربوبیت کے تصور کو پیش کرنے ہی پر اکتفا کیا تھا؟ آپ کے اس طریق سے آپ کے گرد بھیڑ تو اکٹھی ہو سکتی ہے مگر اس بھیڑ میں بہت کم لوگ شرک سے کلی طور پر پاک ہوں گے۔ مثلاً آپ کی جماعت کے ایک رکن کا نام "محمد غوث" ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک ایک ایک مشرکانہ فعل پر انگلی رکھ کر نہیں بتایا جائے گا مسلمان شرک سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لازمی ہے کہ آپ بھی حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرح موجودہ دور کے ایک ایک مشرکانہ فعل کی تشریح کر کے اس کی حقیقت واضح کر دیں۔

(۲) آپ کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں حکومت سب سے بڑا بت اور طاغوت ہے، جس کی پرستش ہو رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حکومت کے کارندے اس بت کے پجاری ٹھیرے، یعنی شرک کے مرتکب۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ایسے اشخاص کو اپنی جماعت میں

شامل ہونے کی اجازت دیتے ہیں جو ریل، ڈاک اور تعلیم کے سرکاری محکموں میں ملازم ہیں؟ اگر آپ اضطرار کی رخصت کی بنا پر یہ اجازت دیتے ہیں تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ایسے تمام لوگ واقعۃً حالتِ اضطرار ہی میں مبتلا ہیں اور رخصت اضطرار کے تمام شرائط اپنے اندر رکھتے ہیں؟

(۳) آپکے خیال میں مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنے نبی کے ذریعہ ایک بادشاہ کے تقرر کی درخواست کرتے ہیں اور انھیں یہ جواب نہیں دیا جاتا کہ جب نبی تمھارے اندر موجود ہے تو تم یہ کیسا مطالبہ کر رہے ہو۔ بلکہ بادشاہ مقرر کر دیا جاتا ہے؟ نیز جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی نبوت سے الگ مستقل طور پر ایک نعمت ہے۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام بھی "ملک" حاصل ہونے کی دعا کرتے ہیں اور ملنے پر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں اور بحیثیت ایک بادشاہی کے ملکۂ سبا سے اطاعت چاہتے ہیں۔ ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہی کی خواہش کرنا بذات خود محمود چیز ہے اور دین کے قیام کے نتیجے کے طور پر اس کا حصول تو اللہ کا مقرر کردہ انعام ہے۔

نیز حضرت موسٰیؑ کا بنی اسرائیل کی ساری قوم کو فرعونیوں کی غلامی سے نکال کر الگ لے جانا بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ بھی اپنی قوم کے افراد کی انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے غلامی سے نجات دلانا ضروری خیال فرماتے ہیں۔ چونکہ نبی کا کوئی فعل اپنی رائے سے نہیں ہوتا اس لیے حضرت یوسف اور حضرت موسٰی علیہما السلام کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے اگر مسلمان کہلانے والی قوم کو سیاسی غلبہ دلانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں ان کے اعمال کی خرابیوں کی اصلاح کی جائے تو یہ طریقہ بھی صحیح ہے۔

جواب (۱) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہمارے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ ہمارا طریق دعوت بعینہٖ وہی ہے جو حضرات انبیائے کرام کا تھا، البتہ زمانہ کے اقتضا سے ہم نے شرک کی اُن اقسام پر اصلی ضرب لگانے کی کوشش کی ہے جو اس عہد میں نہ صرف یہ کہ لوگوں سے مخفی تھیں بلکہ ان کا شمار اجزائے توحید میں ہونے لگا تھا اور وقت کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کو خدا پرستی سمجھے بیٹھا تھا۔ "محمد غوث" جیسے ناموں پر مورچے قائم کرنے والوں اور مردہ خداؤں کی نذروں اور منتوں پر تکفیر کرنے والوں کی تو کمی نہیں تھی، البتہ زندہ خداؤں اور باقتدار طاغوتوں اور آلہہ کی بندگی کو شرک قرار دینے کی نہ صرف یہ کہ جرأت لوگوں میں مفقود تھی بلکہ اس کے شرک ہونے کا تصور بھی مسلمانوں میں مردہ ہو چکا تھا۔ ہم اس وقت یہی کام کر رہے ہیں اور اس کی تفہیم کے لیے ہم جو چیز مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا اثر ان شاء اللہ یہ ہوگا کہ شرک اپنی تمام جلی و خفی قسموں اور اپنے تمام اشباہ و قوالب کے ساتھ ختم ہو جائے گا، اور لوگ اپنے ناموں اور کاموں ہر چیز میں شرک سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۲) ہم موجودہ زمانے کے ان کمزور مسلمانوں کو جو طاغوت کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں تھوڑا سا الاؤنس محض اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ ان پر امر حق واضح کرنے کی کوشش پہلے نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک باطل نظام کی خدمت اس کو باطل سمجھ کر نہیں کی ہے بلکہ اس کو یا تو اسلام اور مسلمانوں کی عزت و سرفرازی سمجھ کر اختیار کیا یا کم از کم اسے حصول رزق کا ایک پاک وسیلہ سمجھا۔ جو لوگ ان کی اس جہالت کو دور کر سکتے تھے، یعنی حضرات علماء، انھوں نے طرح طرح سے اس جہالت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اب ہماری دعوت سے جو لوگ متنبہ ہوئے ہیں اور موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگے ہیں ہم ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے

گروہ دفعۃً جست لگا کر باطل سے حق کی طرف آجائیں گے۔ وہ ایک حد تک مہلت پانے کے بہرحال مستحق ہیں اور جن مسلمانوں تک ابھی ہماری دعوت پہنچی ہی نہیں ہے ان کو تو دعوت پہنچانے سے پہلے ہمیں سرے سے ملامت کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔

(۳) بنی اسرائیل میں بادشاہی کا آغاز نبوت سے الگ ہو کر نہیں ہوا، بلکہ نبوت کے تحت ہوا۔ ہر بادشاہ کے زمانہ میں ایک نبی بھی ہوتا تھا اور وہ سارے نظام میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو نظام جسم میں آنکھ کی پتلی کو حاصل ہے۔ بادشاہ بالکلیہ اس کے تحت ہوتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اس کی ہدایت کے مطابق کرتا تھا۔ توریت میں ہر زمانے کے ملوک اور انبیاء کی تفصیل موجود ہے قرآن میں مقامِ مدح میں ملک کا لفظ اصطلاحی (monarch) کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ مجرد صاحب اقتدار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ یہ اقتدار خدا کے قانون کا بخشا ہوا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے متعلق بھی آپ کو غلط فہمی ہے۔ یہ فرعون سے بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ توریت میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو قربانی کرنے کے لیے کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی راہ کے فاصلہ پر تھا۔ قرآن کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور بلا دلیل توریت کے اس بیان کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ کچھ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ کو دلیل قرار دے کر انگریزوں کی غلامی اور چاکری کو ثواب بتا رہے ہیں اور کچھ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو دلیل قرار دے کر موجودہ تحریک آزادی کو فرضِ دینی بتا رہے ہیں۔ اور ان میں سے کسی بزرگ کو اس بات پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ آخر کیا مذاق ہے کہ ایک نبی یہ پیغام لے کر آئے کہ فرعون کی نوکری کرو اور دوسرا پیغمبر یہ دعوت لے کر اٹھے کہ فرعون کے اقتدار سے آزادی حاصل کرو۔ اگر ان حضرات کی قرآن فہمی کا یہی حال ہو تو عجب نہیں کہ صریح کفر و شرک کو بھی یہ لوگ انبیاء کا لایا ہوا دین ثابت کر دیں۔

گناہ کبیرہ پر تکفیر

سوال: ہم نے اپنی ایک جماعت بنائی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ ہم فسق اور کفر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ ہماری جماعت عام مسلمانوں کو وہی حیثیت دیتی ہے جو قرآن نے اہل کتاب کو دی ہے۔ مثلاً ہم شادی بیاہ جماعت کے اندر ہی کرتے ہیں، غیر جماعتی مسلمانوں سے لڑکیاں تو لے لیتے ہیں مگر اپنی لڑکیاں ان کے عقد میں نہیں دیتے۔

ہمارے اس عقیدہ اور طرزِ عمل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ صحیح ہیں یا غلط؟ اگر غلط ہوں تو تشفی بخش طریقہ پر ہماری غلطی ہم پر واضح فرمایئے۔

جواب: تحقیق کرنے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جماعت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دین کا صحیح علم اور تفقہ رکھتا ہو، اور اس کا ثبوت خود ان مسائل کی نوعیت سے بھی ملا۔ کیونکہ یہ مسائل آپ ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو پیدا کرنے والا ذہن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نظر نہیں رکھتا۔ اب اگر میں یہ کہوں تو اس پر برا نہ مانا جائے بلکہ اسے اُس حق نصیحت کی ادائگی سمجھا جائے جو ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان پر واجب ہے کہ علم دین کے بغیر دین کے مسائل میں رائیں قائم کرنا اور ان کو دین قرار دے کر انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے اصول بنا لینا خود سب سے بڑا فسق اور تمام کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے۔ اس لیے کہ ہم مسلمان اگر ہو سکتے ہیں تو اس دین پر ایمان لا کر اور اس کی پیروی کر کے ہو سکتے ہیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پیش کیا گیا ہے۔

اور اس ایمان اور اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی اصول اخذ کریں اور اپنے عقائد و اعمال کے لیے جن چیزوں کو بنیاد قرار دیں وہ سب کتاب اللہ اور سنت رسول سے ماخوذ ہوں۔ لیکن جو شخص یا گروہ قرآن اور سنت میں بصیرت اور تفقہ نہ رکھتا ہو اور اپنے رجحانات کی بنا پر کچھ رائیں قائم کر کے ان کو دین قرار دے لے وہ حقیقت میں دین کا پیرو تو نہیں ہے، اپنی آرا اور رجحانات کا پیرو ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کبائر کی کیا حقیقت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دین پر ایمان لانے کے لیے جو مجمل علم کافی ہے اور دین کے موٹے موٹے اصول جاننے کے لیے قرآن کی عام فہم تعلیمات کا جو علم اور حدیث پر جو سرسری نظر کافی ہے، اسے مسائل دینی میں رائے قائم کرنے اور دینی طریق پر لوگوں کی رہنمائی کرنے کے لیے کافی سمجھ لینا غلطی ہے اور اسی غلطی کا نتیجہ وہ خطرناک بڑی غلطی ہے جس کی طرف اوپر میں نے اشارہ کیا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں ان مسائل کا مختصر جواب دیتا ہوں جو آپ میرے سامنے پیش کیے ہیں:

کفر دراصل اس چیز کا نام ہے کہ کسی آدمی کے سامنے دین کو پیش کیا جائے یا دین اس کے سامنے پیش ہو اور وہ جان بوجھ کر یا جان بوجھ کر (نہ دیا جاتا ہے) اور پھر وہ اس کو ماننے یا اس کے مطالبات اور احکام میں سے کسی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرے۔ نادانی کی حالت جس میں آدمی دین کو جانتا ہی نہ ہو اور اس وجہ سے اُس کے خلاف زندگی بسر کر رہا ہو، کفر کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ اس کو جاہلیت کہتے ہیں۔

پھر کفر کے متعلق یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو سے کفر اُس منکرانہ اور باغیانہ حالت کو کہتے ہیں جو اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خروج از ایمان ہو۔ دوسرے پہلو سے کفر اس غیر مسلمانہ حالت کو کہتے ہیں جس کے رونما ہونے پر ایک آدمی دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے اس کا تعلق کاٹ ڈالا جائے گا۔

پہلی قسم کے کفر کو معصیت کے ساتھ خلط ملط کرنا زیادتی اور خلاف قرآن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معصیت ایمان کی ضد ہے، لیکن مجرد معصیت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، لازماً ایمان کے مستقل طور پر سلب ہو جانے کی موجب نہیں ہوتی۔ کافر کی طرح مومن سے بھی بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے، البتہ جو چیز مومن کے گناہ اور کافر کے گناہ میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو عین حالت گناہ میں تو ایمان اس سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شہوات نفس کے اس غلبے اور نادانی کے اس پردے سے، جو عارضی طور پر اس کے قلب پر پڑ گیا تھا، باہر نکل آتا ہے تو اس کو شرمساری لاحق ہوتی ہے، خدا سے نادم ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا خوف کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر اس سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہ ہو۔ اس قسم کی معصیت خواہ کتنی ہی بڑی ہو آدمی کو کافر نہیں بناتی، صرف گناہ گار بناتی ہے، اور توبہ اس کو پھر ایمان کی طرف واپس لے آتی ہے۔ برعکس اس کے کافرکے گناہ کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی گناہ گارانہ طرز عمل اور طرز زندگی کو اپنے لیے مناسب اور لذیذ اور درست سمجھتا ہے، اس کو خدا کی اور اس کے حکم کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس نے اس فعل کو گناہ اور حرام قرار دیا ہے۔ وہ پورے اصرار اور استکبار کے ساتھ اسی فعل کا ارتکاب کیے جاتا ہے، ندامت اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔ یہ دوسری قسم کی گناہ گاری سلب ایمان کی موجب ہے اور یہ بجائے خود کبیرہ ہے خواہ اس جذبہ کے ساتھ کوئی ایسا کام کیا جائے جس کو عرف عام میں صغیرہ

سمجھا جاتا ہو۔ ان دونوں قسم کے گناہوں کو ایک ہی حیثیت دینا اور ان پر یکساں کفر کا حکم لگا دینا بالکل غلط ہے اور اس قسم کی افراط و تفریط خود کبیرہ کی تعریف میں آتی ہے۔ پہلی صدی سے آج تک بجز خارجیوں کے یا معتزلہ کے ایک گروہ کے اور کسی نے یہ رائے قائم نہیں کی ہے۔

اب دوسری قسم کے کفر کو لیجیے جو کسی انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے اور مسلمانوں کی برادری سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کے لیے کافی ہو۔ اس چیز کے متعلق جان لینا چاہیے کہ شریعت نے ایسی تکفیر کو ہر کس و ناکس کی بازی کا کھلونا نہیں بنایا ہے۔ جس طرح کسی انسان کے جسمانی قتل کے لیے یہ شرط ہے کہ نظام اسلامی موجود ہو، با اختیار قاضی تمام شہادتوں اور پوری صورت حال پر اچھی طرح غور کر کے پوری تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کرے کہ یہ شخص واجب القتل ہے، تب اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک شخص کے روحانی قتل یعنی تکفیر کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس کے اوپر جو الزام کفر لگایا گیا ہو اس کی ایک قاضی شرع پوری تحقیق کرے، اس کا اپنا بیان لے۔ اس کے اقوال و افعال کو جانچ کر دیکھے۔ شہادتوں پر غور کرے، اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ یہ شخص جماعت مسلمین سے کاٹ کر پھینک دینے کے قابل ہے۔ جہاں ایسا نظام موجود نہ ہو، نہ قضائے شرعی ہو اور نہ وہ شرائط جو تکفیر کے لیے ناگزیر ہیں پوری ہو سکتی ہوں، وہاں تکفیر کا فیصلہ کر دینا اور کسی شخص یا گروہ کو مسلم سوسائٹی سے خارج قرار دینا اگر صحت کا احتمال رکھتا ہے تو غلطی کا احتمال بھی رکھتا ہے، اور یہ افراد کے اور بے اختیار جماعتوں کے شرعی اختیارات سے باہر ہے، اور اس کا فساد اس فساد سے کچھ کم نہیں ہے جو غیر مومن لوگوں کے مسلم سوسائٹی کے ساتھ جڑے رہنے سے رونما ہوتا ہے۔

جو گروہ یا شخص واقعی دینی اصلاح چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ پہلے جاہلوں، گناہ گاروں، اصلی کافروں اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے کاٹ پھینکنے کے قابل کافروں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لے اور جوش و خروش کے ساتھ نہیں بلکہ انصاف کے ساتھ ان کے معاملے میں رائے قائم کرے کہ کس کی فی الواقع کیا پوزیشن ہے۔ پھر جاہلوں تک دین کا علم پہنچانے کی کوشش کرے اور جب وہ اپنے آپ کو خود مسلمان سمجھتے ہوں تو خواہ مخواہ انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کرے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ اس کے بجائے اس کو ان سے یوں کہنا چاہیے کہ جب تم مسلمان ہو، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، مسلمان رہنا چاہتے ہو تو جانو کہ اسلام کیا ہے، اور جان کر اس کی پیروی کرو۔ جن لوگوں کو گناہ گاری کی حالت میں پائے ان کو خدا کا خوف دلائے اور ان کے اندر ایمان کی جو چنگاری دبی ہوئی ہے اس کو بھڑکانے کی کوشش کرے۔ جن لوگوں کے اندر وہ کفر محسوس کرے ان کو کافر کہنے اور ان کی تکفیر کا اعلان کرنے پر اصرار نہ کرے بلکہ اپنی جگہ یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ حالت کفر میں مبتلا ہیں ان کو ایمان کی دعوت دے اور حکمت و موعظت حسنہ سے ان کے دلوں میں ایمان اتارنے کی سعی کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب کسی شخص کے اندر دق کی بیماری محسوس کرے تو اس کا اپنی جگہ یہ سمجھ لینا اور جان لینا ضروری ہے کہ یہ دق میں مبتلا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کا علاج ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک طبیب کے لیے اس سے بڑی اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ جس کسی میں دق محسوس کرے اس کے منہ پر بھی پھٹ سے کہہ دے کہ تو دق میں مبتلا ہے۔ یہ اس کے علاج کا نسخہ تو نہیں ہے بلکہ مار دینے کا نسخہ ہے۔

رہے وہ لوگ جو صریح طور پر اس قابل نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی سوسائٹی سے ان کو کاٹ پھینکا جائے، ان کے معاملے میں صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جب قضائے شرعی موجود نہیں ہے اور ایسا نظام نافذ نہیں ہے کہ جو شخص اسلامی نظام جماعت سے نکال دینے کے قابل ہے اس کو واقعی نکال دیا جائے تو تکفیر اور خروج از ایمان کے اعلانات کرنے سے پرہیز کیا جائے اور صرف اس بات پر اکتفا

کیا جائے کہ اہل ایمان خود ہی ایسے لوگوں سے ولایت اور محبت کے تعلقات اور دوستی و ہم نشینی ترک کر دیں۔ مگر تبلیغ کے لیے ملنے کا دروازہ کسی حال میں بند نہ کرنا چاہیے۔

شادی بیاہ کے متعلق آپ کے طرز عمل کی بنیاد بھی غلط فہمی ہے جو تکفیر کے باب میں آپ لوگوں کو لاحق ہوئی ہے اور اس کے دور ہو جانے سے یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں مزید توضیح کے لیے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مسلم سوسائٹی اس وقت پائی جاتی ہے اس کو جملۃً واحدہ قرار دے کر اس پوری سوسائٹی کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دینا بڑی زیادتی ہے اور ایک غیر شرعی طرز عمل ہے۔ اس سوسائٹی میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو سچے مومن، دیندار اور صالح ہیں، وہ بھی جو جاہلیت میں مبتلا ہیں، وہ بھی جن کے اندر کفر پایا جاتا ہے، اور وہ بھی جو اس قابل ہیں کہ انھیں مسلم سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے مگر اس وقت محض نظام اسلامی نہ ہونے کی وجہ سے ان کو کاٹا نہیں جا سکتا۔ ان سب کو ایک گروہ قرار دے کر ان سے اہل کتاب کا سا معاملہ کرنا آخر کس شریعت کی رو سے صحیح ہے؟ ان میں جو لوگ مومن اور دیندار ہیں ان سے شادی بیاہ کے تعلقات محض اس وجہ سے منقطع کرنا کہ وہ آپ کی جماعت میں نہیں آئے ہیں، بیجا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قسم کی تفریق کرنے کا شریعت نے آپ کو حق نہیں دیا ہے۔ رہے جاہلیت میں پڑے ہوئے لوگ اور وہ لوگ جو فسق و فجور اور کافرانہ خصائل میں مبتلا ہیں، تو ان سے فی الواقع شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں۔ نہ اس بنا پر کہ وہ سب کے سب کافر ہیں بلکہ اس بنا پر کہ شریعت میں ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم شادی بیاہ کے معاملات میں سب سے پہلے آدمی کے دین اور تقویٰ کو دیکھیں۔

غالباً جس چیز نے آپ لوگوں کو اپنی جماعت سے باہر کے تمام مسلمانوں سے اہل کتاب کا سا معاملہ کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ التزام جماعت کے متعلق احادیث کے وہ احکام ہیں جن کی رو سے جماعتی زندگی ہی اسلامی زندگی ہے اور جماعت کے بغیر جو زندگی ہے وہ جاہلیت کی زندگی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات اچھے خاصے صالح مسلمانوں کو بھی جو آپ کی جماعت سے باہر ہیں من شذ شذ فی النار کا مصداق ٹھیرا کر انھیں بیٹیاں دینا جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر یہ آپ کا خیال ہے تو قطعاً ایک غلط خیال ہے۔ حدیث میں جس جماعت کو یہ حیثیت دی گئی ہے کہ اس سے علیحدگی اسلام سے علیحدگی کی ہم معنی ہے، وہ "الجماعۃ" ہے نہ کہ کوئی جماعت جسے چند مسلمان مل کر بنا لیں۔ اور "الجماعۃ" کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو سکتا ہے جو:

(۱) خالص اقامت دین کے لیے بنی ہو یعنی جس کے وجود کا مقصد ہی یہ ہو کہ خدا کے دین کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے عملاً قائم کرے۔

(۲) جس میں اہل ایمان کا سواد اعظم شامل ہو۔

(۳) جس کے ہاتھوں دین کے وہ تمام کام انجام پا رہے ہوں جن کی خاطر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا میں ایک امت مسلمہ قائم ہو۔

ایسی جماعت اگر موجود ہو تو اس سے انقطاع یقیناً دین سے انقطاع ہے اور اس شخص کا ایمان و اسلام ہرگز معتبر نہیں ہے جو اس سے علیحدہ ہو یا علیحدہ رہے۔ لیکن اس نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے اور امت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد جو جماعتیں اس غرض سے بنائی جائیں کہ "الجماعت" کے فقدان کی تلافی ہو، ان میں سے کسی کو بھی الجماعت کے شرعی حقوق و اختیارات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ عملاً الجماعت کے مرتبے پر نہ پہنچ جائے۔ آپ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت ہوں، اور آپ کا مقصد خواہ ٹھیک ٹھیک وہی ہو جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد تھا، اور آپ کے اصول اجتماع بھی وہی ہوں

جو اسلامی نظامِ جماعت کے اصول ہیں، بہرحال شریعت آپ کو یہ حق ہرگز نہیں دیتی کہ آج آپ چند آدمی مل کر ایک جماعت بنائیں اور کل یہ اعلان کر دیں کہ دنیا بھر کے وہ سارے مسلمان غیر مسلم ہیں جو آپ کی اس جماعت میں شامل نہیں ہیں اور ہر اس مسلمان کی موت جاہلیت کی موت ہے جس کی گردن میں آپ کے امیر کی بیعت کا حلقہ نہیں ہے۔ اس طرح کا رویہ آپ اختیار کریں گے تو اپنے شرعی حقوق سے تجاوز کریں گے اور اصلاح کے بجائے امت کے اندر مزید خرابیوں کے موجب بنیں گے۔ آپ خود ہی ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آخر اس بیچارے صادق الایمان و صالح العمل مسلمان کے کافر ہونے کی کیا وجہ ہے جو استکبار و نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ ناواقفیت یا عدمِ اطمینان کی وجہ سے آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہوتا؟ اور اس بات کی کونسی معقول وجہ ہے کہ جماعت بنانے کا حق صرف آپ کو حاصل ہو اور دوسرے مسلمانوں کو نہ ہو؟ دورِ انتشار میں تو اصلاح کی کوشش کرنے والا گروہ لازماً ایک ہی نہیں ہوتا، بلکہ بیک وقت ایسے بہت سے گروہ موجود ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو صحیح مقصد کے لیے صحیح طریقہ پر کام کر رہے ہوں۔ اور بکثرت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو ایک مدت تک یہی فیصلہ نہ کر سکیں کہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہوں یا نہ ہوں اور شامل ہوں تو کس کے ساتھ ہوں۔ اس حالت میں کسی گروہ کا اپنے لیے وہ حقوق ثابت کرنا جو شریعت میں صرف الجماعت کو دیے گئے ہیں، جھوٹ بھی ہے اور فساد انگیز بھی۔ ایسے دعوے کرنے کے بجائے ہر گروہ کو اپنی اپنی جگہ کام کرنا چاہیے، اور اپنے دل میں یہ مخلصانہ خواہش رکھنی چاہیے کہ کسی طرح پھر وہی الجماعت وجود میں آجائے جو عہدِ خلافتِ راشدہ میں موجود تھی، اور ہمیشہ اس بات سے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں اس کی اپنی گروہ بندی اس الجماعت کی پیدائش میں مددگار ہونے کے بجائے الٹی مانع و مزاحم نہ ہو جائے۔

خدا کے ناقص الاعضا بندوں کی حیثیت

سوال: ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی نفس پر ظلم بے جا نہیں کرتا۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ پیدائشی طور پر کیوں اندھا، لنگڑا، لولا یا احمق بنا دیتا ہے؟ اگر اسے نطفہ کی خرابی پر محمول قرار دیا جائے تو بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ ماں باپ کے اندر اگر کوئی نقص تھا تو اس کی سزا بچہ کو کیوں ملے؟ آخر کیا ناکارہ اور عیب دار ہستی پیدا کرنا خدا کے احسن الخالقین ہونے پر ایک دھبہ نہیں ہے؟

جواب: جو سوال آپ نے ہم سے پوچھا ہے، بعینہٖ یہی سوال حضرت مسیح علیہ السلام سے پوچھا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مادرزاد اندھوں کو کس لیے پیدا کیا؟ حضرت نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: "اس لیے تاکہ آنکھ والوں کو سجھائی دے۔" حضرت کے اس ارشاد سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

پہلی یہ کہ مادرزاد اندھے، لنگڑے اور بہرے عبرت اور تعلیمِ خلق کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ جن کو اللہ تعالیٰ نے آنکھ کان اور صحیح سالم اعضاء و جوارح کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ مغرور نہ ہوں اور ان قوتوں کو پا کر زمین میں فساد نہ پیدا کریں، بلکہ ہر دم ان قوتوں کے بخشنے والے کے شکرگزار رہیں اور یاد رکھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو بھی ان اعضاء سے محروم کر سکتا تھا اور پھر وہ کسی طرح بھی ان نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تعلیمِ شکر تمام تعلیموں میں سب سے اعلیٰ اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے

خدا نے ہماری اصلاح کے لیے اس کا انتظام خود اس دنیا کے نظام کے اندر کر دیا ہے (یعنی یہ صورتیں اگرچہ دنیا کے طبعی نظام علت و معلول کے تحت واقع ہوتی ہیں مگر ان سے ایک بڑا اخلاقی فائدہ از خود حاصل ہوتا ہے) اور اس اہم کام کو بالکلیہ ہمارے مدرسوں اور یونیورسٹیوں پر نہیں چھوڑا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ لوگ کسی جرم کی پاداش میں اندھے بہرے نہیں بنائے گئے، بلکہ جس طرح امیر و غریب، کمزور و قوی ہر طرح کے لوگ پیدا کیے گئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ خلق کی رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے سرکاری ڈیوٹی پر مامور ہیں اور قیامت کے دن ان کے اس نقص اور محرومی کی تلافی کی جائے گی اور ان میں سے جو شخص جس درجہ میں اللہ کی نعمتوں سے محروم ہے، اسی قدر وہ نعمتیں حاصل کرے گا اور اس سے جو پرسش ہوگی، اس الاؤنس کے بعد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے بھیس میں خلق کی آزمائش کے لیے اترتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں سے فرمائے گا کہ میں تمہارے دروازہ پر بھوکا آیا تو تم نے مجھے نہیں کھلایا، وغیرہ وغیرہ الیٰ آخر الحدیث۔ اور جب لوگ جواب دیں گے کہ اے پروردگار تو کیسے بھوکا اور بیمار ہو سکتا ہے تو پروردگار فرمائے گا کہ تمہارے دروازے پر جو فلاں سائل آیا تھا وہ میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صالح سوسائٹی میں ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ احترام ہے، بلکہ سوسائٹی کا نظم ہوتا ہی درا صل ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومت اس کی بہترین مثال ہے جس میں سب سے زیادہ حقدار وہ سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ محتاج ہو۔ اس عہد میں جو لوگ اس رمز الٰہی کو سمجھتے تھے ان کا حال یہ تھا کہ جب کسی اندھے بہرے کو دیکھتے، اپنی اچھی حالت پر خدا کے شکر میں سجدہ میں گر جاتے اور جب اس طرح کے لوگوں کی مدد کرتے تو جھک کے مدد کرتے اور اپنے دینے پر فخر کرنے کے بجائے ان کے قبول کرنے پر ان کے ممنون ہوتے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ معذورین خدا کی طرف سے خلق کی تعلیم کی ڈیوٹی پر مامور ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی آستینوں میں خدا کا ہاتھ چھپا ہوا ہے۔

قدرت الٰہی کے ان مظاہر کی وجہ سے جو لوگ خدا کے احسن الخالقین ہونے پر معترض ہوتے ہیں، ان کی نگاہ میں دو طرح کے نقص ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے، ان کی نظر صرف اجزا پر رہتی ہے اور انھیں ان کے فریم کے اندر رکھ کر انھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ کسی حسین رخسار کے تل کو اگر اس کی جگہ سے الگ کر کے دیکھیے تو وہ ایک سیاہ داغ نظر آئے گا، حالانکہ وہی چیز اپنی جگہ پر ایک صاحب ذوق کے لیے غارت گر ہوش و ایمان ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ان اندھوں اور لنگڑوں کو اس دنیا کے نظام مجموعی سے الگ کر کے دیکھیے تو یہ دنیا پر داغ نظر آتے ہیں، لیکن اگر اس کے مجموعہ میں ان کی جگہ پر رکھ کے دیکھیے اور اس مقصد پر بھی نگاہ ڈالیے جو اس مجموعہ کا ان سے پورا ہو رہا ہے تو یہ آپ کو انگشتری پر نگینہ سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیں گے۔ اس دنیا میں لونے اور حسین کی چیخ بھی ہے اور بلبل کا نغمہ بھی اور ان دونوں کے اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے اندر اس ارغنون ہستی کے نغمہ کی اصل دلکشی چھپی ہوئی ہے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر کسی چیز کے صرف مادی پہلو تک محدود رہتی ہے، اس کی گہرائیوں کے اندر اتر کر اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کا اندازہ نہیں کرتی۔ ایک پتھر ان کو کھردرا نظر آیا اور ان کی نظروں سے گر گیا، حالانکہ صاحب نظر اس کھردرے پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے۔ امید ہے کہ ان اشارات سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

آپ نے یہ جو اعتراض کیا ہے کہ نطفہ کے ذریعے والدین کے جسمانی و ذہنی عیوب و نقائص کا انتقال اولاد میں ہونا ناانصافی ہے۔ در اصل اس کی اساس بھی کائنات کے مجموعی نظم و مفاد کو نظر انداز کرکے غور کرنے پر ہے۔ اچھا، اب فرض کیجیے کہ آپ کا مجوزہ انصاف دنیا میں نافذ کر دیا جائے اور بیج کے اثرات سے پودے کو اور نطفہ کے اثرات سے حیوانی بچوں کو آزاد کر دیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ گندم سے جو اور جو سے گندم پیدا ہونے لگے۔ گدھے سے خرگوش اور اونٹ سے مینڈک اور مچھلی سے آدمی برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ باپ کی ٹانگیں دو تھیں، بچے کی چھ ہو گئیں۔ ماں کی ناک چہرے پر تھی، بیٹے کی پیٹھ پر جا لگی۔ دادا کے تمام جسم پر بال تھے اور پوتے صاحب ایک روئیں سے بھی محروم ہیں۔ کسی کا قد بارہ فٹ ہو اور کسی کا چھ انچ۔ کوئی گوشت خور درندوں کی صفات لے کر پیدا ہو اور کوئی گھاس کھانے والا چوپایہ بن کر نکلے! — قانون توارث کو اگر اس نظام کائنات میں معطل کر دیا جائے تو پھر تو کوئی سے دو جانداروں میں اتنی مشابہت نہ رہ سکے گی کہ انہیں ایک نوع یا جنس میں شمار کیا جا سکے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو قانون نافذ فرمایا ہے بہ حیثیت مجموعی وہی کائنات اور انسانی دنیا کے لیے مفید ہے اور محض چند جزئی ناخوشگواریوں کی وجہ سے اسے غیر حکیمانہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ختم قلوب کا مفہوم

سوال:۔ ایک ہندو دوست اسلام کے دروازے پر کھڑا یہ اعتراض کرتا ہے کہ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے ماتحت کوئی شخص راہ ضلالت پر چلتا ہے تو اس کا اپنا کوئی قصور نہیں، بلکہ (نعوذ باللہ) قصور اللہ کا ہے۔ اس صورت میں جزا و سزا بے معنی ہے۔

جواب:۔ قرآن حکیم کے بیان کردہ اصول و سنن پر رائے زنی کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گہری بصیرت کے ساتھ ان پر تدبر کیا جائے اور قرآن کی ساری تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر آیات کا مفہوم متعین کیا جائے۔ آیت زیر بحث پر جو اشکال وارد کیا گیا ہے وہ انہی شرائط اولیہ کا لحاظ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ایک صاحب فہم و بصیرت کے لیے اس میں کوئی اشکال نہیں۔

کسی فعل کی نسبت کسی کی طرف مختلف اعتبارات سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اس سے مقصود نفس اس فعل کی نسبت نہیں بلکہ اس قانون کی نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے بنا دیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا نے بلحاظ فطرت تمام انسانوں کو یکساں نیکی اور بدی الہام فرمائی ہے۔ بعد میں جو لوگ اپنے اختیار سے نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کو نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور جو لوگ بدی اور سرکشی کی راہیں اختیار کرتے ہیں ان پر بدی کی راہیں فراخ کی جاتی ہیں۔ پھر اگر وہ بدی میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نیکی کی طرف لوٹنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا تو ان سے نیکی کی وہ صلاحیت بھی سلب ہو جاتی ہے جو ان کو ابتداءً فطرت میں عطا ہوئی تھی۔ اسی چیز کو قرآن نے "ختم قلوب" سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ مذکورہ قانون الٰہی کے مطابق واقع ہوتا ہے اور یہ قانون عین حکمت و عدل کے مطابق ہے۔ اور اسی وجہ سے خدا کو حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی گمراہیوں پر سزا دے اور نیکیوں پر جزا۔ قرآن میں جہاں خدا کی مطلق مشیت کا بیان ہوتا ہے یا مطلق اضلال کا ذکر ہوتا ہے وہاں اس کی قدرت کاملہ اور اس کے بلا شرکت غیرے تصرف کا بیان مقصود ہوتا ہے۔ اس کی حکمت اور اس کے مذکورہ قانون عدل کی نفی مقصود نہیں ہوتی۔

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

سوال:- سورۂ ہود کی حسب ذیل آیات مہدویوں کے نزدیک بڑی اہم ہیں جن سے حضرت سید محمد جونپوری کی مہدویت کا ثبوت نکالا جاتا ہے:-

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ کِتٰبُ مُوْسٰۤی اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

اس آیت میں "بَیِّنَةٍ" "یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ" اور "کِتٰبُ مُوْسٰی" کو ایسی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے جن کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ "اَفَمَنْ" کے "مَنْ" کو کوئی خاص ہستی ہی مراد لی جاسکتی ہے، نہ کہ کوئی غیر معین شخص۔ آگے چل کر "فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ" میں چونکہ خطاب خود رسول اللہ سے ہے کہ آپ اس بارے میں شک میں نہ پڑیں تو اس سے یہ حجت قائم کی جاتی ہے کہ "فَمَنْ" کے "مَنْ" سے ذات رسول مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ یہاں اشارہ ذات مہدی کی طرف ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت کی تشریح فرمایئے۔

جواب:- آپ نے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ مہدوی اس آیت سے کس طرح استدلال کرتے ہیں، اس وجہ سے جواب میں ان کے دلائل کو پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ البتہ ہم آیت کی صحیح تاویل بالاختصار بیان کر دیتے ہیں، اس سے غلط توہمات کی بنیاد خود بخود ڈھے جائے گی۔

اس آیت سے اوپر کی آیات میں، کفار قرآن کی جو مخالفت کر رہے تھے اس کا بیان اور ساتھ ہی اس کا جواب ہے، اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ کون لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کون لوگ نہیں ایمان لائیں گے۔ اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی۔ اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ الآیة (کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے ایک بصیرت رکھتے ہوں اور اس کے بعد ان کے سامنے ایک شاہد آئے خدا کی جانب سے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بن کر آچکی ہے۔ وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے، اور جو اس کا انکار کریں گے جماعتوں میں سے تو جہنم ان کی وعدہ گاہ ہے۔ پس تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو وہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہ لائیں گے (۱۷۔ ہود)

اس میں ایمان لانے والی جماعت اور اس کے وجوہ ایمان کی وضاحت کر دی گئی ہے لیکن ایمان نہ لانے والوں کے صرف انجام کو بیان کیا گیا ہے، ان کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مقابل کا ذکر دوسرے مقابل پر خود دلیل تھا اور استفہامیہ جملوں میں یہی اسلوب عام ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ اگر اس محذوف کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری عبارت یوں ہوگی "کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے بصیرت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو بصیرت سے محروم ہیں یکساں ہوں گے؟ — دونوں اس قرآن کے باب میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس پر ایمان صرف پہلا گروہ لائے گا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر اولاً تو خدا کی بخشی ہوئی بصیرت موجود ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی

شکر گزاری واجب ہے، وہ انسانوں کو شتر بے مہار نہیں چھوڑے گا بلکہ اس نے جزا کا ایک دن ضرور مقرر کیا ہے اور اس دن نیکوکار اپنی نیکیوں کا اور بدکار اپنی بدیوں کا بدلہ پائیں گے۔ ثانیاً ان کے پاس خدا کی طرف سے ایک شاہد آ کر انہی حقیقتوں کی شہادت دیتا ہے اور وہ اپنی فطری بصیرت سے جن باتوں کو خود حق خیال کرتے تھے انہی کو وہ مزید مبرہن، مدلل اور آشکارا کرتا ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ سے وہ اس سے کوئی بیگانگی نہیں محسوس کرتے بلکہ اس کو اپنا درد آشنا اور اپنے ہی دل کی بات کہنے والا سمجھتے ہیں۔ ثالثاً وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے تورات آ چکی ہے جو اسی طرح آسمانی وحی کا صحیفہ ہے۔ اس میں اس کی پیشینگوئیاں درج ہیں اور اس کی تعلیمات میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بصیرت اور وحی الٰہی کی اس کے ساتھ مطابقت اور پھر تورات کی ان ساری باتوں کی طرف امام (Guide) کی طرح رہنمائی ان کے لیے کسی بحث و جدال کا موقع نہیں چھوڑتی اور وہ تمہاری باتوں پر سنتے ہی ایمان لاتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ کر چکے ہیں، اور تمہاری باتیں سرے سے سننے ہی نہیں ہیں اور تورات کو بھی پس پشت ڈالے ہوئے ہیں ان سے ایمان کی توقع نہ رکھو۔ یہ سب لوگ خواہ کفار قریش میں سے ہوں یا یہود میں سے یا نصاریٰ میں سے، سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان سب کی متحدہ مخالفت کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ تمہاری دعوت ہی میں کوئی غلطی ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہوا حق تو یہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ آیت کا سیدھا سادہ مطلب عرض ہوا ہے۔ اب اس کے بعد اسی سورہ سے ہم اس آیت کے شواہد نقل کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آیت کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے دوسرے مواقع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:-

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ	کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ تو سہی اگر میں بینہ پر ہوا، اپنے
مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ	رب کی جانب سے اور اس نے مجھے بخشی اپنے پاس سے رحمت
عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ	اور وہ تم سے پوشیدہ ہو جائے تو کیا ہم اس کو تم پر زبردستی چپکا سکتے

ہیں درانحالیکہ تم اس سے نفرت کر رہے ہو۔

اس آیت میں "بینہ" سے مراد وہ فطری بصیرت ہے جو نبی میں بعثت سے پہلے موجود ہوتی ہے اور رحمت سے مراد وحی ہے جو اس کی فطرت کے بالکل مطابق ہوتی ہے اور جس سے انکار کرنا اپنی فطرت سے لڑنے کے ہم معنی ہے۔ نبی کی قوم میں سے جن لوگوں کی فطرت مسخ نہیں ہوتی ہے وہ بھی اس وحی کو اپنے دل کی صدا ہی سمجھ کر قبول کرتے ہیں، البتہ جو لوگ اپنی فطرت کو مسخ کر لیتے ہیں ان کے اندر اس روشنی کے نفوذ کے لیے کوئی راہ باقی نہیں رہتی اور کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ وحی کی تعلیمات کو ان کے اوپر چپکا سکے۔

حضرت صالح فرماتے ہیں:-

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ	کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں ایک بینہ پر ہوں اپنے رب کی جانب
مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ	سے اور وہ اپنے پاس سے مجھے رحمت بخشے تو اس کے بعد اگر میں اس
اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ	کی نافرمانی کروں گا تو کون اس کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا۔

یعنی فطرت اور وحی دونوں کی رہنمائی کے بعد بھی اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو خدا کے غضب سے مجھے کون بچا سکے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا

کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک بینہ پر ہوں اور وہ مجھے بخشے اپنی طرف سے اچھی روزی۔

اس آیت میں بھی بینہ سے مراد فطری بصیرت ہے البتہ وحی کے لیے رزق حسن کا لفظ یہاں آیا ہے اور وحی کی یہ تعبیر قرآن میں بھی موجود ہے اور اگلے صحیفوں میں بھی کلام الٰہی کو رزق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

تلا یتلو کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ تلاوت کرنا اور کسی شے کا کسی چیز کے پیچھے آنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اگر تلاوت کے معنی لیے جائیں تو ضمیر مفعول کا مرجع مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ ہوگا جس کا ذکر آیت ۱۲ میں بھی ہوا ہے۔ اور بعد میں آیات ۱۳، ۱۴ میں بھی ہے۔ اور پیچھے آنے کے معنی لیے جائیں تو ضمیر کا مرجع بینہ کا لفظ ہوگا۔ اور باعتبار مفہوم ضمیر مذکر کی لائی گئی ہے جو عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے یعنی بینہ سے برہان اور دلیل وغیرہ مراد لے لیں گے۔

شَاهِدٌ سے مراد حضرت جبریل بھی ہو سکتے ہیں اور آنحضرت صلعم بھی اور وحی الٰہی بھی، اور یہ تینوں باعتبار حقیقت ایک ہیں۔ آنحضرت صلعم کے لیے شاہد حضرت جبریل امین ہیں اور دوسروں کے لیے آنحضرت صلعم اور قرآن حکیم۔

مَنْ سے مراد یہاں کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ اولاً تو مَنْ سے کسی خاص شخص کو مراد لینا عربیت کے خلاف ہے۔ اصلاً یہ نکرہ کے لیے آتا ہے۔ ثانیاً یہاں اس بات کی تصریح ہوگئی ہے کہ مَنْ سے مراد یہاں جماعت ہے کیونکہ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ مَنْ کی طرف ہے اور اُولٰٓئِكَ جمع کے لیے ہے نہ کہ واحد کے لیے۔ چنانچہ فعل بھی یُؤْمِنُوْنَ جمع استعمال ہوا ہے۔

فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ میں ضمیر مجرور کا مرجع مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے آنحضرت صلعم کو اس وحی الٰہی کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہیں تھا، لیکن اس کی مخالفت اس شدت و قوت کے ساتھ اور پوری قوم کی طرف سے ایسی ہم آہنگی کے ساتھ ہو رہی تھی کہ آنحضرت صلعم کا عزم تبلیغ اس متحدہ مخالفت کے مقابل میں ضعیف ہو رہا تھا، اور جیسا کہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ سورج کی طرح واضح بات بھی اگر اس کی متحدہ مخالفت کی جائے تو کہنے والے کی نظر میں دھندلی ہونے لگتی ہے۔ اسی وجہ سے اس موقع پر سخت ضرورت تھی کہ آنحضرت صلعم کے عزم و یقین کو پابرجا رکھنے کے لیے آپ کو تسلی دی جائے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کس قدر سخت حالات سے آنحضرت صلعم دوچار تھے اور آپ کے قلب کی پریشانیوں کا کیا حال تھا (فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ)

اس آیت کی نظیر اس سے پہلے والی سورہ، سورہ یونس میں موجود ہے جس سے اس مفہوم کی مزید تشریح ہو جاتی ہے۔ فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ، لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ

(اگر تم شک میں ہو اس چیز کے متعلق جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب کی تلاوت کر رہے ہیں (یعنی اہل کتاب) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آیا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور نہ ہو ان لوگوں میں سے جنہوں نے اسکی آیات کی تکذیب کی ہے کہ نامرادوں میں سے ہو جاؤ بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کا کلمہ حق ہو چکا ہے وہ اس کتاب پر ایمان نہیں لانے کے)

اس طرح کے مواقع پر شک اور تذبذب وغیرہ کی جو نسبت نبی کی طرف کی جاتی ہے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مواقع میں نبی بحیثیت اپنی امت کے وکیل کے مخاطب ہوتا ہے اور امت میں بہتیرے ایسے ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کی متحدہ مخالفت کے سبب سے ان کی نظروں میں وہ حق مشتبہ ہو جائے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ حالت نیک نیت سے نیک نیت انسان پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ ایک نیک نیت آدمی جب دیکھتا ہے کہ جس بات کو وہ مان رہا ہے اس کے سوا سب اس کے خلاف ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو کبھی کبھی اس کا یقین بھی متزلزل ہونے لگتا ہے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ اس طرح کے مواقع میں نبی پر جو اظہار عتاب ہوتا ہے اگرچہ ظاہر میں اس کا خطاب نبی کی طرف ہوتا ہے لیکن در اصل اس کی خفگی کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو حق کی تکذیب کرتے ہیں۔

ان مختصر اشارات سے امید ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم آپکے سامنے آجائے گا۔ اگر کوئی بات مزید توضیح کی محتاج ہو تو اس کو کمرر دریافت فرما سکتے ہیں۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

(Pakistan)

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے، اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ، طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان — جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مددگار ثابت ہوگی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانا نے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جلد شائع ہو رہی ہے

ملنے کا پتہ:

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور۔ پاکستان

سرورق رچن پریس، لاہور میں چھپا